

سید ذہب اویجہ

شاعر و شخص

اختراچہاں

# علم حقوق کی مصنف محفوظ

غیر ۱۹۹۱ء

۵۰۰ - پانچسو

ابوضوان کرونل

نیشنل فائیس پرنٹنگ پریس

چارکمان حیدرآباد

اختر جہاں

پہلی اشاعت

نقداد

کتابت

طباعت

نام مصنف

پیشہ

مکان نمبر

11 / 210

امین پیروڈ

کڑپہ - 16001

ناشر - نیشنل بک ٹرسٹی کمان حیدرآباد - ۱۰۰ پی

# انتساب

والد محترم  
جناب محمد عبدالفتاح اور صاحب کے نام  
جن کی تعلیم و تربیت سے آج میں اس قابل ہوں

آپس جہاں

# فہرست

- ۱۔ حرف آغاز ۵
- ۲۔ پیش گفتار ۱۳
- ۳۔ پس منظر ۱۸
- ۴۔ حالات زندگی ۴۷
- ۵۔ وجد کی نظم نگاری ۱۰۷
- ۶۔ وجد کی غزل ۱۹۰۔
- ۷۔ وجد کا مرتبہ اردو شاعری میں۔ ۲۴۰
- ۸۔ سکتا بیات ۲۷۰
- ۹۔ رسائل و جرائد ۲۷۷

# حرف آغاز

مرحوم جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتگان شعرا میں جو نام خصوصیت کے حامل ہیں ان میں سکندر علی وحید کا نام بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اپنے شاندار ماضی اپنی منفرد تہذیب و خوش آئند روایت کے باعث ہمیشہ ہی سرخرو رہا۔ وچہ اسی روایت کے شیلہ کلا سکیٹ کے وارفتہ اور رومانیت کے والہ ہیں۔ انہوں نے مندرجہ بالا تمام خصوصیات کو رنگ شعر میں رواں کر دیا اور ساتھ ہی شعر کی شیرینی اور غنائیت کی چاشنی سے بھی اپنے کلام کو مزین کیا۔ اس کے علاوہ احوال گذشتہ اور مسائل حال کی بھی ان کے کلام میں ترجمان ملتی ہے۔ حب الوطنی کی خوشبو سے بھی ان کا کلام مہکا ہوا ہے۔ و نیز ان کی حدیث دل بھی اس میں پڑھی جاسکتی ہے۔

# فہرست

- ۱۔ حرف آغاز ۵
- ۲۔ پیش گفتار ۱۳
- ۳۔ پس منظر ۱۸
- ۴۔ حالات زندگی ۵۷
- ۵۔ وجد کی نظم نگاری ۱۰۷
- ۶۔ وجد کی غزل ۱۹۰۔
- ۷۔ وجد کا مرتبہ اردو شاعری میں۔ ۲۴۰
- ۸۔ سکتا بیات ۲۷۰
- ۹۔ رسائل و جرائد ۲۷۷

# حرف آغاز

مرحوم جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتگان شعراء میں جو نام خصوصیت کے حامل ہیں ان میں سکندر علی وحید کا نام بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اپنے شاندار ماضی اپنی منفرد تہذیب و خوش آمدت روایت کے باعث ہمیشہ ہی سرخرو رہا۔ وحید اسی روایت کے شیلہ کلا سکیٹ کے وارفتہ اور رومانیت کے والہ ہیں۔ انہوں نے مندرجہ بالا تمام خصوصیات کو رنگ و روغن میں رواں کر دیا اور ساتھ ہی شعر کی شیرینی اور غنائیت کی چاشنی سے بھی اپنے کلام کو مزین کیا۔ اس کے علاوہ احوال گذشتہ اور مسائل حال کی بھی ان کے کلام میں ترجمانی ملتی ہے۔ حب الوطنی کی خوشبو سے بھی ان کا کلام مہکا ہوا ہے۔ و نیز ان کی حدیث دل بھی اس میں پڑھی جاسکتی ہے۔

ایسے باکمال شاعر کو موضوع تحقیق نہیں بنایا گیا۔ اس کی ایک وجہ خود بچہ کی خود نگہداری بھی ہے کہ مقامی درسگاہوں میں تحقیق کیلئے وجہ کے فن پر قلم اٹھانے کی جرأت بہت کم ہوئی اور اگر کسی صاحب نے یہ جرأت کرنی بھی چاہی تو سُن گن پاتے ہی وجہ نے متعلقہ کالج کے پرنسپل کو خط لکھ کر اس سے باز رکھا یا پھر خود محقق سے چند بے سرو پاسوالا کر کے اس کا قافیہ تنگ کر دیا اور اس کو یہ باور کر دیا کہ وہ اس موضوع پر تحقیق کا مستحق نہیں

وجہ کا تعارف ۱۹۷۷ء میں خود ان کے ایک مضمون "میں اور میرا فن" سے ہوا تھا۔ جوان دنوں ہفتہ روزہ بلٹنر میں شائع ہوا تھا۔ وجہ کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے اشعار کو پہلے بھی کہیں پڑھا یا سنا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی شخصیت اور ان کے کلام سے پہلا تعارف تھا۔ بعد ازاں ام۔ اے کے آغل کرے کی عرض سے کئی موضوعات پر نظر گئی لیکن اس موضوع سے واپس نہیں لوٹی اور میرا تحقیقی موضوع "سکندر علی وجہ شخصیت اور فن" طے پایا۔

مواد کی فراہمی کے سلسلے میں کئی مرتبہ حیدرآباد کے سفر



کرنے پڑے۔ کئی نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ  
 کے پہلے مجموعہ کلام "نہو ترنگ" کی عدم دستیابی بھی ایک مسئلہ  
 بن گئی تھی۔ مختلف کتب فروشوں سے منفی جواب ملا۔ حیدر آباد  
 کے کتب خانوں میں بھی اس کی تلاش بے سود رہی۔ ایسے ہی دشوار  
 گزار راستوں میں لغزش پا کا اندیشہ رہتا ہے۔ تاہم میں اپنے  
 نگراں محترم پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی عمیق دل سے سپاس گزار  
 ہوں کہ انہوں نے میری شکستہ ہمت کو حوصلہ بخشا۔

”موضوع کی تبدیلی ضروری نہیں کام جاری رکھیے

کہیں نہ کہیں مجموعہ کلام بھی مل جائے گا۔“

اور ہوا بھی یہی کہ ایک موقع پر محترم پروفیسر شہم علی صاحب نے  
 یہ شردہ سنایا کہ وجد کا مجموعہ "نہو ترنگ" میسوریونیورسٹی لائبریری  
 میں موجود ہے تو خاصا اطمینان ہوا۔ یوں مجھے اس کے مطالعے  
 کا موقع ملا۔

شاعر کو اپنے روزمرہ عا کالات میں دیکھتے خود اپنی

شخصیت اور شاعری کے بارے میں ان کے تاثرات سے واقف  
 ہونے کیلئے تسوید مقالہ سے پہلے وجد صاحب سے ملنا چاہتی تھی

۸  
 خوش قسمتی سے مجھے اس کا موقع ملا۔ لیکن جب میں اپریل  
 ۱۹۴۷ء میں اورنگ آباد پہنچی تو میری بد قسمتی سمجھئے کہ وحید صاحب نے  
 علیل بلکہ فریش تھے۔ ان کی حالت بڑی نازک تھی۔ وہ بات  
 بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ان کی زندگی کے آخری ایام تھے۔ میں نے  
 وحید صاحب کی برحسب گھوٹی نذرہ سنجی اور خوش طبعی کے کمی  
 واقعات سن رکھے تھے۔ اب تو دیکھا تو بس خموشی ہی خموشی  
 چھائی ہوئی تھی۔ اس موقع پر اور کیا کرتی وحید صاحب کی اہلیہ  
 اور ان کے بعض رشتہ داروں اور دوست احباب ہی سے گفتگو  
 کر سکی اور جتنا مودل سکالے میچیدر لشکستگی اور مالیوسی کے  
 عالم میں واپس لوٹی۔

وحید خطوط لکھنے میں بے نیاز تھے۔ بہت کم لوگ ہوں گے  
 جن کی وجہ سے خط و کتابت تھی۔ لیکن ان کے خطوط اپنی شگفتگی  
 اور شائستگی میں انشا پر دازی کے شہ پارے ہیں۔ محترم عابد علی خاں  
 صاحب مدیر روزنامہ سیاست اور جناب مریم بلگرامی صاحبہ کی بے حد  
 مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنے موصومہ وحید صاحب کے خطوط کے نقول  
 سے مجھے نوازا۔

مواد کی فراہمی کے سلسلے میں پروفیسر ہاشم علی صاحب  
 پروفیسر مفتی تبسم صاحب، پروفیسر رفیعہ سلطانیہ صاحبہ کی سپا  
 گزار ہوں۔ جنہوں نے اپنے معلومات سے مستفیض ہونے کا موقع  
 دیا۔ مرحوم جناب محمد علی عباسی (آئی۔ اے۔ اے) جناب  
 وقار خلیل صاحب، کامریڈ کلیم اللہ صدیقی صاحب، پروفیسر نور محمد  
 صاحب محترمہ جیلانی بانو کی بھی تہنہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اور  
 ساتھ ہی اورنگ آباد کے ڈاکٹر مظہر محی الدین، ڈاکٹر صفی الدین صدیقی  
 جناب اختر الزما ناصر، ڈاکٹر نعمت جاوید کی ممنون ہوں جنہوں نے  
 اپنے گراں قدر معلومات سے مستفیض کیا۔ محترمہ زبیدہ خاتون اہلیہ  
 وحید کی بھی سپاس گزار ہوں جنہوں نے اپنی ذاتی پریشانیوں کے باوجود  
 ہسپتال ہی میں ایک اچھا خاصا انٹرویو دیا۔ وحید کے برادر زادے  
 جناب اشرف علی صاحب کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے وحید کے  
 حالات زندگی سے متعلق معلومات بہم پہنچائے۔

یوں تو یہ مقالہ ۱۹۸۳ء ہی میں یونیورسٹی میں پیش کیا  
 گیا تھا اور جون ۱۹۸۴ء میں مجھے ام۔ فل کی ڈگری بھی ایوارڈ ہو گئی  
 لیکن دیگر تعلیمی مشاغل و مصروفیات کی وجہ سے اب تک

۵  
 میں نے اس مقالہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اسی انشاء  
 میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے یہی کتاب سما کا خصوصی  
 تہ "وحد شاعر و شخص" مرتب کیا تھا۔ اب مجھے بھی اس مقالہ  
 کی اشاعت کا خیال آیا چنانچہ ضروری ترمیم و اضافے کے بعد  
 یہاں اسے کتابی شکل دیدی ہے۔ پہلے باب میں اس پس منظر کو  
 پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ جس میں کہ وحد جیسے باکمالوں کی  
 پرداخت ہوئی۔ دوسرے باب میں وحد کی شخصیت و حیات کا  
 اسی تہذیبی و ادبی پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں  
 وحد کی نظم نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں شاعر کے  
 غزلیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور پانچویں باب میں مجموعی طور پر  
 ان کی شاعری کو ملحوظ رکھ کر ممکنہ حد تک غیر جانب داری اور ادبی  
 دیانتداری کے ساتھ مقالہ کی تسوید کی گئی ہے۔

اب جو دیکھا تو اشاعت کا مسئلہ درپیش تھا۔ جو میرے  
 بس کا نظر نہیں آ رہا تھا میں ان دنوں ڈگری کالج رانچوٹی میں بحیثیت  
 جزوقتی کچرہ کام کر رہی تھی۔ یہاں کے حالات کتاب کی اشاعت  
 کے لئے سازگار ثابت نہ ہو سکے۔ ایسے میں مجھے اپنے ہائی اسٹول

کے بزرگ استاد محترم عبدالرؤف صاحب کی وہ پیر کیف فصیحۃ  
یاد آئی !

” جو پہلے پست نہ ہوں و لو لے پڑ مر رہ نہ ہوں  
وقت کے سانچے میں ڈھل کر ہی نکھرتی ہے حیات“  
امرا ج یہ مقالہ وقت کے سانچے میں ڈھل کر نکھرا رہا ہے۔  
جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سپاس و شکر گزاری کا رواج  
ایک فرسودہ روایت ہے۔ لیکن ہندوستان نے اپنی تہذیبی  
ورثہ میں روایات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بحیثیت ہندوستانی  
اس ورثہ کے دکھوائے ہیں بھی روایات کی پاسداری ضروری  
ہو جاتی ہے۔ اور میں سپاس گزاری کی روایت کو یوں بھی نہیں چھوڑنا  
چاہوں گی لہذا میں سب سے پہلے محترم استاد پروفیسر سلیمان اطہر جابو  
صاحب کی سپاس گزاریوں۔ جنہوں نے مجھے ام۔ فل میں داخلے  
سے پہلے ہی شعور تحقیق سے روشناس کرایا اور ام فل کے دوران  
قوشاید انہوں نے نگرانی کا درد سہ قبول کر کے اور بھی سرفراز کیا  
اگر ان کی حوصلہ افزائیاں شامل حال نہ ہوتیں تو آگے بڑھنا محال تھا۔  
ساتھنیوں میں جناب ڈاکٹر رفعت النساء کی بھی مشکور ہوں

میں کا تعاون مجھے ہر حال میں ملتا رہا۔ اور ڈاکٹر سید عبدالستار صاحب کی بھی ممنون خاص ہوں جبکہ تعاون نہ صرف تسوید مقالہ تک آئے ہوئے بلکہ اس مقالہ کی اشاعت کی قریب قریب تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر لے کر میرے دیرینہ خواب کو شرمندہ تعبیر کیا۔

کاتب جناب ابورضوان صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس مقالہ کی کتابت میں لگن اور حسیتی کا مظاہرہ کیا۔ جناب ہاشم مشتاق علی مالک نیشنل فائین پریسنگ پریس کی بھی شکریہ گزار رہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ اب میں اپنے محترم ماموں جان عبد الغفور خاں صاحب کی بھی سپاس گزار ہوں جن کے فیض تربیت نے نہ صرف مجھے ناچیز کو زیور علم سے آراستہ کیا۔ بلکہ اس مقالہ کی طباعت کے سلسلے میں بھی میری اعانت فرمائی۔

# پیش گفتار

سکندر علی وحید جامعہ عثمانیہ کے نامور فرزند اور اردو کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے ہاں وہ نعرہ بازی، گورچ گرج، زندگی کے تعلق سے مرنے مٹنے کا جذبہ، چھٹنے چھٹنے کی باتیں، اور دم ہماچی نہ ملتی ہو، لیکن بہر کیف زندگی کو انہوں نے اپنی آنکھ اور اپنے زراویہ سے دیکھا ضرور ہے۔ اور شاعری میں اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ ہندوستان کی ثقافت، ہمارے تہذیبی ورثہ ہمارے کلچر اور تمدن کی باقیات کی علامتوں، اقدار اور نشانات کو انہوں نے بھرپور انداز میں اپنے کلام میں اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ کچھ یہ بھی وجہ تھی کہ وہ عدلیہ کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے اور پھر کچھ ان کا مزاج کہ سیاسی اور ادبی گروہ بدلیوں سے خود کو دور رکھا۔ نہ کسی سیاسی جماعت میں شریک ہوئے نہ کسی ادبی انجمن سے ایسا واسطہ رکھا۔ اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی پورا کیا، اور شعر و شاعری کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔

وجد طالب علمی کے زمانے سے شعر کہتے تھے۔ اور جامعہ عثمانیہ  
 کے دوران میں (جس کو جامعہ کا عہد زریں بھی کہنا چاہیے) کے مقبول  
 شاعروں میں رہے۔ جس میں ان کے ترنم کا بھی حصہ تھا۔ اور یہ  
 مقبولیت ان کے آخر دم تک برقرار رہی۔ راست و چپ سے دورانی  
 دھن میں انہوں نے شعر گوئی کی۔ ان کے کئی شعری مجموعے ہوئے ہوتے تھے  
 اور اوراق مصور، بیاض مریم وغیرہ شائع ہو چکے ہیں اور اب "جمال اجنتا"  
 جلال ہمالہ — ادب گروہ بندلوں سے دور رہنے کی وجہ سے وجد کو  
 جو بھی فائدہ ہوئے ہوں یہ نقصان ضرور ہوا کہ اردو تنقید نے ان کی  
 سمیت کم تو خیر کی۔ اس میں ان کی خود پسندی اور شہرت گریز مزاج کو بھی  
 دخل رہا۔ غرض ان کی شخصیت اور فن پر بہت کم بلکہ برائے نام لکھا گیا۔  
 عرصہ سے خواہش تھی کہ وجد پر لکھا جائے لیکن کوئی موقع نہ ہوا۔  
 اور جب چند سال قبل ام۔ اے کا نتیجہ لکھنے کے بعد اختر جہاں تے  
 ام فی کی خواہش ظاہر کی اور وجد کی شخصیت اور شاعری سے ایک  
 گونہ دلچسپی کا اظہار کیا تو میں نے ریسرچ کے لئے ان کی نگرانی کی  
 ذمہ داری بغیر کسی تکلف کے قبول کر لی۔  
 اختر جہاں کو شعر و ادب اور لکھنے لکھانے سے ابتداء سے



شغف ہے۔ یہی شغف انھیں ام۔ اے اور ام۔ فل (اردو) کی  
 سمت کشاں کشاں لے آیا۔ اپنے مقالہ کے لئے انہوں نے بہت زیادہ  
 محنت کی۔ ترویجی میں رہ کر وجد کے جاننے والوں، احبابِ پیرستاروں  
 اور اردو شعر و ادب پر نظر رکھنے والوں پر سمر اسٹھت کے ذریعہ رابطہ پیدا  
 کیا۔ ادبی جرائد کے پرانے فائلوں کی ورق گردانی کی اور خاطر خواہ مواد  
 یکجا کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ یہی نہیں انہوں نے تین چار سترے حیدر  
 کے چکر لگائے اور وجد کے لئے اورنگ آباد کا سفر بھی کیا۔ وجد کو دیکھیں  
 لیکن ان سے تبادلہ خیال کرنے کا موقع نہ ملا کہ ان کی شمعِ زندگی  
 گل ہونے والی تھی۔ وہ فریش تھے اور ان سے ملنے ملانے پر پابندی  
 تھی۔ بہر کیف جعفر کہ ایک ریسرچ اسکالر کے حیطہ امکان میں  
 ہوتا ہے اختر جہاں نے کوشش کی اور وجد کی حیات اور شخصیت کے  
 بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کیں۔ ان کے شعری  
 مجموعے حاصل کئے اور وجد کے خطوط تک بھی ان کی رسائی ہوئی  
 اس سارے جہاں کی چھان پھٹک کے بعد اس کو نہایت سلیقہ  
 سے پیش کیا۔ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اختر جہاں نے معروضی  
 نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور وجد کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا ممکنہ

گہرائی کے ساتھ محاسبہ کیا ہے۔ وجہ کو غزل اور نظم دونوں پر بلا کی  
 قدرت حاصل تھی ان کی غزلوں کے جہاں کی اشعار دریاں زرد خاص و  
 عام ہیں۔ ان کی نظموں کے کئی اشعار بھی لوگوں کو ناز بر ہیں۔  
 آخر جہاں نے غزل اور نظم کے لیے علاحدہ علاحدہ ابواب قائم کرتے  
 ہوئے سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ اور آخر میں دیگر شاعروں کے  
 کلام سے وجہ کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے اردو شاعری میں  
 وجہ کی اہمیت واضح کی ہے۔ کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے  
 مقالہ میں مناسب اور ضروری ترمیم اور حذف و اضافہ سے کام لیا گیا ہے  
 زبان و بیان پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے اور ترتیب بھی تھوڑی بہت  
 ادھر ادھر ہوئی ہے۔ اس طرح ام۔ فل کا یہ مقالہ کتابی صورت  
 اختیار کرتے ہوئے خاصا چست اور متوازن ہو گیا ہے۔ وجہ پر  
 کتاب نما کے خصوصی شمارے سے قطع نظر جو اس مقالہ کی تسوید  
 کے کہیں بعد شائع ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ آخر جہاں کی یہ کتاب  
 وجہ پر پہلا ملبسور اور اہم کام ہے۔ مجھے یقین ہے اردو شعرو  
 ادب سے دلچسپی رکھنے والے عموماً اور وجہ کی شخصیت اور  
 شاعری کے بارگاہ اور پرستار خصوصاً اب کتاب کا خیر مقدم کریں گے۔

اس کتاب میں یہاں وہاں کمی محسوس کیجا سکتی ہے جس کا باعث وہ سہولتیں ہیں جو اختر جہاں کو بوجہ حاصل نہ ہو سکیں۔  
مجھے توقع ہے اختر جہاں تحریر و تصنیف کا کام جاری رکھیں  
گی اور اپنی صلاحیتوں سے نئے لکھنے والوں میں اپنا مقام بنائیں گی۔

۱۳ اپریل ۱۹۹۰ء

شعبہ اردو

سلیمان اطہر جاوید

یس۔ وی۔ یونیورسٹی۔

تروٹی (آئندھرا پردیش)

# پس منظر

بیسویں صدی کا آغاز بین الاقوامی طور پر تہذیبی ادبی اور سیاسی زندگی میں کمی نژادوں سے اہمیت رکھتا ہے۔ چین میں بغاوت شروع ہو چکی تھی، ترکی انقلابی حالات سے دوچار تھا۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں عوامی حکومت تشکیل دی جا چکی تھی ۱۹۱۷ء میں امریکہ نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایران بھی اپنے خواب گراں بیدار ہو رہا تھا۔ جاپان نے روس جیسی عظیم طاقت کو نیچا دکھا کر یورپی ممالک کی برتری کے گھمنڈ کو پارہ پارہ کر دیا تھا، خود ہندوستان میں بھی ایل ٹا آ لابرطانوی سامراج کے خلاف جوش و جذبات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور قومی آزادی کی جدوجہد تیز تر سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی، بیسویں صدی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے، ہندوستان کا معاشرتی اور سیاسی نقشہ بھی تبدیل ہونے لگتا ہے پہلی جنگ عظیم کا اندوہناک سانحہ اور حالی و شبلی جیسے ادبی رہنماؤں کی

وفات کے المناک حادثے ۱۹۱۷ء ہی میں رونما ہوتے ہیں، جس  
سن میں کہ سکندر علی و جد کی پیدائش علی میں آئی ہے  
آفتاب پیدایا بطن گیتی سے ہوا

آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کی تلک  
(اقبال)

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام علی میں آپکا تھا۔ انیسویں  
صدی میں ہی علی گڑھ کالج کی تاسیس بھی پڑچکی تھی، لیکن بیسویں  
صدی کی ابتدا تک وہ انگریزوں کا آلہ کار تھی! اس کے سربراہ  
نواب وقار الملک کو انگریزوں کی بدخواہی کا بخوبی علم تھا لہذا انہوں نے  
۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں ایک انجمن کا افتتاح کیا جو محمدی پولیٹیکل  
آرگنائزیشن کے نام سے موسوم ہوئی اب ہندوستانی مسلمانوں  
کے سیاسی شعور نے ایک نئی کروٹ لی۔ اس انجمن کا مقصد  
مسلمانوں کی رہنمائی کرنا اور ان کے دل و دماغ کو ان غلط فہمیوں  
صاف کرنا تھا۔ جو علی گڑھ کالج کی بدخواہی کے زیر اثر دہائی تھیں  
مسلمانوں میں ایک غلط خیال عام تھا کہ برطانوی حکومت کی فرمانبرداری  
ہی میں ان کا مفاد مضمر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہماری آزادی میں

مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اس وقت علی گڑھ  
پارٹی کے ہاتھ میں تھی، اس کے رکن اپنے آپکو  
سر سید کی پالیسی کا امین سمجھتے تھے۔ ان کا بنیادی  
عقیدہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو برطانوی تاج کا وفادار

اور قومی تحریک سے الگ اور بے تعلق رہنا چاہیے۔

مسٹر آرچ بولڈ پر نسل علی گڑھ کالج نے مسلمانوں کے جذبات  
کا لحاظ رکھتے ہوئے مصالحت سے کام لینا چاہا حکومت اور مسلمانوں  
کے درمیان مصالحت اور مقابمت کی راہ ہموار کی جس کا نتیجہ ۱۹۰۶ء  
میں مسلم لیگ کے قیام کی صورت میں رہا۔ اس دوران نواب  
وقار الملک اور پر نسل آرچ بولڈ کے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی۔  
بالآخر وقار الملک نے ۱۹۰۷ء میں قومی مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے  
مسلم لیگ کے دفتر کو علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل کر دیا اور پر نسل  
آرچ بولڈ کو اتنا مجبور کیا کہ ان کو مستعفی ہونا پڑا۔ اب مسلم لیگ  
خالص سیاسی مسائل سے متعلق ہو گئی۔ کئی مسائل پر اس نے

لے ابو الکلام آزاد (مترجم محمد مجیب) ہماری آزادی اور اینٹ لائنگ میں بیٹن سہلی اشاعت

سوانح لیس کی حمایت کی تاکہ آگے چل کر ہندو مسلم اتحاد کیلئے راہ  
 ہموار ہو۔

مولانا آزاد نے قومی آزادی کی تحریک کو پیش نظر رکھتے ہوئے  
 جون ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا جسکی اشاعت سارا صوفیوں  
 میں ایک انقلاب آیا۔ اسکی مقبولیت کو دیکھ کر حکومت  
 کو بڑی پریشانی ہوئی، اخبار سے کئی بار مضامینوں کا مطالبہ کیا جو بہت  
 جلد ضبط کر لیا جاتا اس کے علاوہ ۱۹۱۵ء میں پریس ایکٹ کے تحت  
 "الہلال" پریس کو بھی ضبط کر لیا گیا۔ حکومت کی ستم ظریفی کو نظر انداز  
 کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک دوسرا اخبار "البلاغ" جاری کیا  
 اس پرچے کی بدولت انھیں عوام کے جوش و خروش کو ابھارتے ہی  
 کہا حقہ، مد ملی۔

۱۹۱۷ء بین الاقوامی طور پر کھرام بن کر آیا نئی مسائل کی  
 فراوانی کی وجہ سے برطانوی حکومت کو اب ہندوستانیوں کو  
 سمجھنے اور ان کے مسائل سلجھانے کا موقع ہی نہیں رہا۔ وقتی طور پر  
 انھیں خاموش کرنے کیلئے جھوٹے وعدوں سے کام لیا گیا، سبز باغ  
 دکھائے گئے لیکن ہندوستانیوں کے جذبات کو خاموش نہیں کیا جاسکا

۱۹۱۶ء کے کہتے آتے ہوم رول کی صدا ہندوستان کے گوشے گوشے سے آنے لگی جس کا اثر شعراء نے بھی قبول کیا۔ چکیست کی کئی منظومات میں وطن کی عظمت، انقلاب، ہند اور ملک کے نامساعد حالات کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ "وطن کا رنگ" آوازہ قوم اور ہم ہوں گے عیش ہوگا ہوم رول ہوگا " اسی زمانے کی تخلیقات ہیں جن میں اس دور کے حالات کی عکاسی ملتی ہے۔

حکومت انگلستان نے ہندوستانیوں سے جو وعدے کئے تھے وہ کبھی پورے کرنے کیلئے نہیں گئے تھے۔ جنگ کے اختتام پر اس نے خلاف وعدہ نہ صرف ہندوستانیوں کو سیاسی حقوق سے بے دخل کیا بلکہ "رہلٹ ایکٹ" کے تحت غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کر دیا۔

روز و شب سلسلہ حادثہ پیمائی ہے  
وقت حالات کا خاموش تماشائی ہے (وقید)

نوابانِ حیدر آباد کو برطانوی حکومت سے کسی قسم کا اندیشہ نہ تھا اور نہ ان کے درمیان کسی قسم کی کشیدگی تھی اس کے باوجود جو عظیم انقلاب وہاں پر اردو ذریعہ تعلیم کی صورت میں رونما ہوا۔



اس سے خود حکومت ناواقف تھی۔ یہ ایک طمانچہ تھا، بیسی ذریعہ تعلیم پر جب سال ۱۹۱۱ء میں سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع تخت نشین ہوئے تو انہیں ریاست کے انتظام اور اس کی قلاح و بہبود کے بہترین مواقع میسر آئے۔ موصوف کے عہد میں مشہر کے انتظام اور اسکی تہذیب میں ایک جدت پیدا ہوئی، اور یہ جدت اور ندرت نہ صرف مشہر کی انتظامی کمیٹی تک محدود رہی بلکہ عوام کے ذہنی تصورات اور رجحانات تک بھی رسائی حاصل کر چکی تھی بقول ڈاکٹر زور۔

خود شہر کی سڑکوں اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ اس میں رہنے والوں کے خیالات اور رجحانات میں بھی تبدیلی شروع ہو چکی تھی اور یہ شہر جدید تہذیب اور روشنی کا مرکز بننے لگا۔ ۱۔

عوام میں ابھی آزادی یا غلامی کا کوئی صحیح شعور نہیں تھا۔ ان کے پیش نظر علی گڑھ کی تعمیری حیثیت ہی نمایاں نظر آرہی تھی۔ یوں بھی لے ڈاکٹر سید محی الدین قادری "داستان ادب حیدرآباد" ادارہ ادبیات

آصف جاہ سالج کا عہد حیدر آباد میں شعر و ادب کے فروغ کا  
 بہترین عہد تھا اسی دور میں کئی انجمنیں مثلاً "ایجوکیشنل کونفرنس"  
 "انجمن ترقی اردو" اور "انجمن ارباب اردو" وغیرہ قائم ہوئی تھیں۔  
 وہجہ کے اشعار ہیں :۔

قدرت نے جس کو علم و فضل و ہر دیا تھا  
 جوش عمل دیا تھا ذوق نظر دیا تھا

حیران تھا زمانہ وہ کر و فردیا تھا  
 فطرت نے جسکی شب کو لور سحر دیا تھا  
 یہ ہے دکن ہمارا پیارا وطن چھرا (ترانہ دکن)

آصف جاہ چہلم کے جانشین مختار الملک کے عہد ہی سے حیدر آباد میں  
 اردو یونیورسٹی کھلی جو ہمارے دور ہی تھی اسکے باوجود یونیورسٹی کا قیام  
 عمل میں نہیں آیا تھا۔ اس لئے اس میں نظام کالج کا قیام عمل میں آیا۔  
 جو مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ مصارفِ کثیر کے باوجود یہاں  
 سے الطبعیاتی بخش شائع ہوا۔ مگر یہاں ہو سکے۔ ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے  
 صرف تین طلباء کی کامیابی بظاہر زوالِ علم کی غماز تھی۔ جبکہ دارالعلوم  
 جہاں مولوی فاضل تک تعلیمی سہولتیں فراہم تھیں۔ دن دوئی رات چوگنی

فرقی کرنے لگا جسکی وجہ سے عوام ایک ایسی یونیورسٹی کا متکسار  
 خواب دیکھنے لگے جن میں مدریۃ تعلیم انگریزی کی بجائے اردو ہو  
 ۱۹۱۴ء میں ایجوکیشنل سوسائٹی قائم ہوئی جسکے بنیادی مقاصد میں  
 جامعہ نظام کا قیام بھی شامل تھا۔ جسکا ذریعہ تعلیم اردو ہو۔

یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو جب ہوم سکرٹری سر اکبر حیدری کی صدارت  
 میں ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا تو انہوں نے اپنی  
 صدارتی تقریر میں اس بات کی پیشن گوئی کی۔

”خدا نے چاہا تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان  
 یونیورسٹی ہو جائے گا جسکی نظیر ہندوستان بھر میں نہ  
 ہوگی اور جس کا فیض دور دور تک پہنچے گا اور لوگ ملک  
 ملک سے اس سے مستفید ہوتے کے لئے آئیں گے اور  
 حیدرآباد مرکزِ علم و فنون بن جائے گا۔“

اس پیشن گوئی کے ساتھ ہی انہوں نے جامعہ کے قیام کیلئے سرکاری  
 طور پر فضا بھی ہموار کی اور ۱۹۱۶ء میں ایک عرضداشت بنام سلطان العلوم  
 لے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زوردارستان ادب حیدرآباد ادارہ

میر عثمان علی خان آصف سابع تحریر کی گئی جس میں اس عہد کے رہنماؤں اور خیر خواہوں کی خواہش کے مطابق اپنی نوعیت کی ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی طرف متوجہ کیا گیا جس کا ذریعہ تعلیم عام جامعات سے بہت کمزور ہو اور انگریزی کو دوسری لازمی زبان کی حیثیت دی جائے۔

آصف سابع نے اس عرضداشت کو وقت کا تقاضا سمجھ کر بخوشی منظور فرمایا۔ اور ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو ایک فرمان صادر کیا جسکی رو سے جامعہ عثمانیہ کے قیام کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی ان مسائل کے حل کیلئے تجاویز بھی شامل کی گئیں جو جامعہ کے قیام کے بعد رونما ہو سکتے تھے۔

اس فرمان کو علی جامعہ پہنانے کے لئے سب سے پہلے جو مسئلہ درپیش تھا وہ اردو زبان و ادب میں اعلیٰ درجہ کی معیاری کتابوں کی تیاری کا تھا جن کو حاصل کرنے کیلئے ۲۴ اگست ۱۹۱۷ء کو سررشتہ تالیف و ترجمہ Bureau of Compilations Translations کا قیام عمل میں لایا گیا جو دارالترجمہ کے نام سے معروف ہوا۔ جس میں معیاری ادبی و غیر ادبی نصابی کتابوں کا اردو میں

ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اور کئی علمی اصطلاحات جو یورپ کی جدید زبانوں میں لاطینی اور یونانی سے لی گئی تھیں۔ ان کو زبان کے مزاج سے ہمکنش کیا گیا جنکی تعداد پچیس ہزار سے بھی زائد ہے اس کا خوش آئند کو انجام دینے کیلئے ملک کے تجربہ کار علماء لائق ادباء و شعراء کو مدعو کیا گیا۔ جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مرزا ہادی رسوا، قاضی تلمذ حسین، مولانا عبداللہ عمادی، محمد الیاس برنی، سید سعید ہاشمی، فرید آبادی، اور خوش سلیح آبادی جیسے مایہ ناز ارباب علم شامل تھے۔ ان صاحبان نے اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیئے۔ تاکہ پولیس ایکشن کے بعد بانی جامعہ میر عثمان علی خان کو ریاست حیدرآباد کی حکمرانی سے سبکدوش ہونا پڑا۔ اسکے بعد دارالترجمہ کی سرگرمیوں پر بھی ایک طرح کا جمود طاری ہو گیا۔ ۱۹۵۷ء میں جب جامعہ کا ذریعہ تعلیم اردو کی بجائے انگریزی قرار دیا گیا تو اس دارالترجمہ کی کچھ ایسی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ چنانچہ ترجمہ و اشاعت کا کام بھی رول دیا گیا اسکے باوجود ۱۸ اگست ۱۹۵۷ء کی شب، اس گنج گراں مایہ کیلئے رستخیز یہ جا ثابت ہوئی جبکہ بعض بدستاروں نے سازش کر کے اس عظیم ادارے کی عمارت میں (مبینہ طور پر) آگ لگا دی

اور نایاب و کمیاب تخمیناً اسی ہزار سے ایک لاکھ کی مالیت کی تصانیف و تالیفات نذرِ آتش ہو گئیں۔

دارالترجمہ کے قیام کے بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۱۸ء کو منشور خسروی کی رو سے جامعہ کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا اور اسکا دستور و ذیلی قواعد بھی بنائے گئے۔ یکم ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ بمطابق شمس ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو بروز پنجشنبہ جامعہ عثمانیہ کا افتتاحی تقریب آفانرل میں منعقد ہوئی۔

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ مخدوم محی الدین، سکندر علی و سید صمد ضوی ساز، اور نگیش جیسے شعراء جامعہ کی ادبی و شاعرانہ مرتبت کو بڑھانے میں اہم حصہ لیا۔ یہ دور حیدر آباد میں اردو کے عروج و اقبال کا دور تھا۔ خصوصاً شعراء کیلئے تو مناسب ترین عہد تصور کیا جاتا ہے۔ و جدتے بھی اپنے اشعار میں اس دور کی یادوں سے چلراں کا سماں پیدا کر دیا ہے۔

رو زندگی میں جو گزرے غم لہجوں

ان آوارہ لمحوں کو جی ڈھونڈتا ہے!

شہر کے ہر گوشے میں شعر و شاعری، بیت بازی، مشاعرے

اور مناظرے مہوا کرتے تھے۔ کوئی تقریب ایسی نہیں ہوتی تھی جہاں غزل سرائی کی رسم ادا نہ ہوتی ہو۔ حیدر آباد کے ادب و آداب میں غزل اور متغزلین کو وہ مقام حاصل تھا جو شاید ہی کسی اور کو حاصل رہا ہو، نہ صرف جوان بلکہ معمر بھی شاعر و شاعری کے میدان میں نت نئے گل بوٹوں کی گلکاری کرتے اور وہ راگ اپتے تھے کہ سب دم بخود ہو جائیں۔ یہی وہ پس منظر ہے جو اس دور کے مزاج کو مترشح کرنے کیلئے کافی ہے۔ مشاعرے ہر چند سچوتے ہی رہتے تھے۔ درسگاہوں کے ان مشاعروں کا بھی رواج تھا جن میں شعر اساتذہ اور نوخیز طلباء ایک ساتھ اپنے اپنے کلام سے اہل محفل کو محظوظ ہونے کا موقع فراہم کرتے۔ اور ان گھریلو مشاعروں کا بھی چہر چا تھا۔ جو پرتکلف طعام و بے تکلف محفل سا غروب جام کے یحییٰ مہمانوں کی سامعہ نوازی کیلئے منعقد ہوا کرتے تھے۔ ہر طرح کی نشست میں بلا امتیاز مہمان و میزبان سب اپنا اپنا کلام پیش کرتے و نیز ریڈیائی مشاعروں کا بھی رواج ہونے لگا تھا۔ جن میں شعراء اپنا کلام ریڈیو کے ذریعہ ملک کے تمام افراد تک پہنچایا کرتے تھے۔ اور عام مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے کا حیدر آباد انیسویں صدی کی دہلی اور

اور لکھنؤ کی میٹرک لف یا دو تازہ کرتا ہے۔ وہی سخن پرور ماحول  
 وہی طور طریقہ وہی ادب و آداب رکھ کر کھاؤ اسی طرز کی مجلسیں اور مشاعرے  
 غرض ہر چیزیں دہلوی اور لکھنوی تہذیب کا ایک شگفتہ اور شستہ  
 نکس نظر آتا تھا۔ یہاں بھی نظم کی نسبت غزل کی پندیرائی زیادہ تھی۔ ہر  
 شاعر کیلئے غزل گوئی گویا ضروری تھی۔ لیکن زبان پر مقامی بول چال  
 کی وہ چھاپ نظر نہیں آتی تھی۔ جو قلی قطب شاہ اور اسکے بعد کے دکن  
 شعرا کے کلام میں نمایاں تھی۔ و سجد نے اس صورت حال کو یوں تلخیص کیا ہے  
 یہی شہری غزالوں کا وطن ہے۔ :-۔ نیستان غزل ارضِ دکن ہے  
 درسِ انشاء ڈاکٹر سید محی الدین قادری نذیر مرحوم نے جامعہ  
 عثمانیہ کے ہونہار طلباء کی علمیت و قابلیت کو نکھارنے کے لئے  
 ۲۵ جنوری ۱۹۲۳ء کو ادارہ ادبیات اردو کی بنا ڈالی جہاں دکن کے  
 قدیم اردو شعراء کے غیر مطبوعہ کلام اور ادباء کی تخلیقات کو زیرِ طبع  
 سے آراستہ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس ادارے سے کئی طلباء کی  
 تخلیقات بھی شائع ہوئیں۔ اور ۱۹۲۳ء کے شروع ہی سے ماہنامہ  
 "سب رس" کا اجرا ہوا۔ اس طرح حیدر آباد کے نو عمر ادیبوں اور  
 شاعروں کو طبع و اشاعت کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ خود جامعہ عثمانیہ



سے ایک سہ ماہی رسالہ مجلہ عثمانیہ ۱۹۲۷ء میں جاری ہو چکا تھا۔  
 یہ مجلہ بھی طلباء کو مستطیع کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ اس مجلہ  
 میں اردو اور انگریزی کیلئے دو حصے مختص تھے اور دونوں حصوں  
 کے مدیر کا انتخاب طلباء کی رائے ہی سے ہوتا تھا۔ جس میں اسکی  
 ادبی استطاعت کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ جسکی نگرانی دو پروفیسروں  
 کے ذمہ ہوتی تھی۔ جامعہ کے فیض یافتگان کو اب اپنے اطراف  
 اکناف کا بھی شعور حاصل ہو چکا تھا۔

ریاست حیدرآباد کے عوام اب ہندوستان کی قومی تحریکوں  
 سے نا بلد نہیں تھے۔ جلیان والا باغ کا واقعہ، شک ستیہ گرو اور  
 اسی طرح کی کئی چیزوں نے انہیں کافی متاثر کیا تھا۔ اب انھیں  
 صرف دوئی کی اصلیت کا پتہ بھی چلا۔ اب دکن اور ہندوستان  
 کے درمیان جو پتی حائل تھی اسکی نزاکت کا بھی صحیح اندازہ ہو گیا۔  
 انہوں نے ہندوستان کو غیر یا پڑوسی نہیں بلکہ اپنا سمجھا۔ انہیں  
 یقین تھا کہ برطانوی عفریت کا ظلم و استبداد ان کی آن میں نہیں  
 بھی اپنی پلیٹ میں لے سکتا ہے۔ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء یوں بھی کوئی سیاسی  
 پارٹی موجود نہیں تھی۔ اسکے باوجود مجلس اتحاد المسلمین کے حامیوں کی

ایک کثیر تعداد شہر حیدر آباد میں تھی۔ پوشیدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آ رہا تھا۔ کانگریس پارٹی کے حمایتیوں کی تعداد بھی کافی تھی پتا نچہ ریاست حیدر آباد ایک ایسے تہذیبی موڑ پر تھی جنکو ہم سیاسی پیچیدگی سے موسوم کر سکتے ہیں۔ عوام شخصی اور جمہوری حکومتوں کے مابین پائے جانے والے فرق سے نبرد آزما تھے اسی اثناء ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے جو ہندوستان میں نمودار ہوئی تھی۔ حیدر آباد کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی متاثر کیا اور خاص طور پر سکندر علی وحید کے ہم عصر مخدوم محی الدین اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اکثر شعراء نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو اپنے اشعار میں ڈھالتے کی کوشش کی اور ساتھ ہی برطانوی حکومت کے ہولناک پہلوؤں کو بھی اپنی منظومات میں جگہ دی تاکہ عوام کو برطانوی عفریت کے بڑھتے ہوئے جبر و استبداد کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

ایسے شعراء میں چکبست، حسرت موہانی، بوشلیح آبادی اور سکندر علی وحید کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں۔ سکندر علی وحید عالم طالب علمی سے کانگریس سے متاثر تھے۔ (اور ان کا یہ تعلق

تادم حیات رہا، اپنی ابتدائی منظومات اور غزلیات میں جہاں تھا  
گنجائش نکل آئی انہوں نے وطن کی آزادی کے گیت بگائے۔ اس سلسلہ  
میں ان کی بعض منظومات اور غزلوں کے بعض اشعار کو یہ سناہ مقبولیت  
حاصل ہوئی۔ بالخصوص یہ شعر جس کا ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی اپنے  
ایک مکتوب میں حوالہ دیا ہے۔

نگاہ اہل گلشن کہہ رہی ہے  
خزاں جاگے بہار آئے نہ آئے

وحد ایک حساس شاعر ہونے کے علاوہ دیدہ بینا بھی  
رکھتے تھے انہوں نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے محسوسات کو  
عوام کے دل و نظر سے قریب کیا انکی ابتدائی منظومات اپنی روانی  
و شبابیائی کیفیات کے علاوہ موعظت آمیز لہجہ بھی رکھتی ہیں۔ جو سامعین  
کو متاثر کئے بغیر رہ سکتا۔ شاعر کی زبان نڈا کتنا اثر تھا اس کا  
فی الوقت شاید اندازہ نہ لگے۔ لیکن یہ ضرور پہچان کر اس وقت احوال  
میں تھوڑی بہت گرمی پیدا ہونی تھی اور ہوئی۔ لہذا ہم اس جزوی  
تبدیلی کا شاعر ہی کو محرک متصور کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جو بھی باتیں  
اپنی منظومات میں پیش کی ہیں وہ سب اس وقت کے تقاضوں کو

مدِ نظر رکھ کر رہی ہیں۔ طالبِ علم جو بڑی حد تک حساس ہونے کے ساتھ ساتھ ہوشیلے بھی ہوتے ہیں۔ وہ جدتِ دورانِ اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں آہیں آنے والے حوادث سے باخبر کیا۔

۱۹۳۷ء میں جب انہیں عدالتی سُرٹینگ کے سلسلے میں سینا پور (اور دھ U.P.) جانے کا موقع ملا تو انہوں نے وہاں کی زندگی کو ایک بدلے ہوئے وسیع پس منظر میں دیکھا برطانوی ظلم و ستم، جبر و استبداد کے تدارک کے لئے انہوں نے بہت کچھ سمجھا اس وقت ہندوستانیوں پر ایک پٹرِ مرگ سی چھا گئی تھی یہم ظلم و ستم بہتے بہتے ان کے حوصلے بہت ہو چکے تھے۔ ہمیں جواب دے چکی تھیں قوتِ ارادی کا تو پہلے ہی سے فقدان تھا۔ مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے سب کے دل بچھ گئے تھے۔ ان واقعات نے وہ جد کے حساس دل کو چھلنی بنادیا اور ایک نامعلوم جذبہ حب وطنی کا ان کے اشعار سے جھلکنے لگا۔ اب وہ حقیقت بین و حقیقت آگاہ شاعر ہو گئے جسکی نوکِ قلم سے نئی تابندگی کے اشعار جاری تھے۔ شاعر جو ایک عثمانی سے مخاطب تھا اب ریاستِ حیدرآباد کے عوام سے ہی نہیں

یہی وہ زمانہ ہے جس میں کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی  
 جنگ عظیم کے اختتام پر برطانوی وزیراعظم مسٹر ویرل اپنے عہدے  
 سے سبکدوش ہوئے اور ان کی جگہ لیبر پارٹی کے مسٹر اٹلی وزیراعظم  
 مقرر ہوئے۔ لیبر پارٹی کو اہل ہند کی آزادی اور ان کے سیاسی حقوق کے  
 تحفظ سے دلچسپی تھی۔ لہذا ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں ایک عارضی  
 مخلوط حکومت قائم کی گئی جس کے وزیراعظم جواہر لال نہرو اور وزیر  
 مالیات مسلم لیگ کے نمائندے مسٹر یاقوت علی خاں مقرر ہوئے۔  
 لیکن یہ تجربہ عملی طور پر ناکام رہا جسکی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد خطرے  
 میں پڑ گیا۔ جب یہ شگوفہ کھلا تو وجد کو بڑا دکھ ہوا اور انہوں نے نظم  
 ”اندیشے“ لکھی۔ مخلوط حکومت کا یہ منصوبہ آزادی کا حل تو نہیں بن سکا  
 اس کے برعکس آزادی کی کرن اور بدھم ہوتی نظر آنے لگی۔  
 اتحاد کسی بھی صورت میں ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ جون  
 ۱۹۴۷ء کو قانون آزادی ہند منظور ہوا جسکی رو سے طے پایا کہ  
 ملک کی تقسیم عمل میں آئے گی اور پاک تان تشکیل دیا جائے گا۔  
 دیسی ریاستوں پر برطانوی حکومت کی بالادستی اٹھ جائے گی۔

اور وہ خود مختار ہو جائیں گے اور انہیں یہ حق حاصل رہے گا کہ وہ جس ملک کے ساتھ چاہیں اپنے دستوری تعلقات استوار کر سکیں۔

قانون آزادی ہند کو رو بہ عمل لانے کیلئے حکومت برطانیہ نے لارڈ مونٹ بیٹن کو ہندوستان بھیجا اور حالات نے کچھ ایسی تبدیلی لی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ جسکے پہلے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن اور وزیراعظم جواہر لال نہرو مقرر ہوئے آزادی کے آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد وسجد کی مسرور نظموں کو ہر طرف مسرت ہی مسرت نظر آنے لگی۔ اس خوشگوار منظر کو دیکھنے کے بعد اسی خوشی و مسرت کو انہوں نے اپنی نظم آفتاب تازہ میں مقید کر لیا۔ نظم بشارت میں انہوں نے جین کل کی بشارت دی تھی وہ کل آج آچکا تھا۔

اک دن نواز خواب حقیقت میں ڈھل گیا

نخل امید اہل نظم بار و رہے آج !!

محسوس ہوا رہا ہے انوکھا سہانا پن

اک سادہ جھونپڑا ہی سہی اپنا گھر ہے آج

ویسے بعض شعراء ایسے بھی تھے جنہیں یوم آزادی حقیقت آمیز  
نظر نہیں آ رہا تھا۔ ۷

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر  
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر

(فیض احمد فیض) چلے تھے یا کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں  
یہاں فیض کی اشتراکیت پسندی اور وجد کی کانگریسی انگریزیت

کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے بقول اشفاق حسین "وہ سخت گاندھی

وادی ہیں۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۶ء تک کمر کا نگر بیس رہ چکے ہیں۔" ۸

وجد محسوس سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ یوم آزادی کی رنگینیوں نے بھی

انہیں جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ لیکن یہ رنگینی تو بس لمحات رہی جلد

منتشر ہو گئی۔ فرقہ وارانہ فساد جس کو ہم بس ایک دو نظروں میں پڑھ لیتے

ہیں اس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ایسے بھی اتنے واقعات رونما ہو

رہے تھے جو انسانیت کی روح کو مجروح کرنے کیلئے کافی تھے۔

۸ سو نیر جشن و جد اور رنگ آباد۔ دسمبر ۱۹۸۲ء اشفاق حسین

"بیاضی مریم"۔

صحنہ ہی ملک کی تقسیم کے سلسلے میں کبھی مطمئن نہیں تھے۔ فرقہ  
یووارانہ فسادات نے ان کے ٹوٹے دل پر اور بھی ستم ڈھائے اور اسکو

پارہ پارہ کر دیا۔ پنجاب، سندھ، بنگال، صوبہ سرحد کے علاقوں میں پناہ  
گزینوں کے جھنڈے جھنڈے سرو سامانی کے عالم میں ایک مسئلہ  
بن گئے۔ دونوں ممالک کا لگ بھگ چھ لاکھ کا جانی اور کروڑوں کا  
مالی نقصان ہوا۔ خون آشامی، قتل و غارتگری کا جو بازار گرم ہوا وہ اس  
کے پہلے شاید کسی زمانے میں ہوا ہوگا۔ ان واقعات سے ایک شاعر کا  
متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ وہجہ نے ۱۹۴۷ء میں نظم "جنتا کی فریاد" لکھی جو  
ایک درد بھری سرگزشت ہے۔ ایک سچے ہندوستانی بلکہ خود ہندو  
کے دل کی فریاد ہے۔ قتل و غارتگری کا جو اندوہناک منظر دکھائی دے  
رہا تھا اسکی تصویر انہوں نے بڑی خوبی سے کھینچی ہے۔

تباہی کا طوفان ہے چاروں طرف

ہر اک طفل و پیر و جوان لٹ گیا

آزادی ہند سے پہلے یعنی جولائی ۱۹۴۷ء سے لارڈ مونت بیٹس  
کی یہ کوشش رہی کہ حکومت ہند اور نظام کے تعلقات خوشگوار رہیں  
اس سلسلے میں موصوف نے اکثر نظام کے آئینی مشیر مونکنٹن اور



وزیر اعلیٰ نواب چھتاری سے گفت و شنید کی، باوجود اس کے اگست ۱۹۴۷ء تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ آزادی کے بعد بھی نظام کو الحاق کیلئے دو مہینوں کی مزید مہلت دی گئی۔ حیدر آباد میں مجلس اتحاد المسلمین کے سربراہ نواب بہادر یار جنگ اور اکثر ان کے قائدین کو ہندوستان سے حیدر آباد کا الحاق مطلق پسند نہ تھا۔ جس کی وجہ سے نظام سابق کو الحاق کی صورت میں خون آشامی کا اندیشہ نظر آ رہا تھا۔ انہیں اس بات کا بھی ڈر تھا کہ حیدر آباد کی خود مختاری مستحکم نہیں رہ سکتی۔ تاہم بسیار کے بعد انہوں نے نومبر ۱۹۴۷ء میں معاہدہ قائمہ پر دستخط کئے۔ لیکن ایک ماہ کے گزرنے کے بعد پھر فضا مکر رہ گئی۔ اور سال نو کے آغاز کے ساتھ ہی ہندو حیدر آباد کے تعلقات میں رخنہ پڑا ہو گیا۔ دہلی ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کے۔ ایم منشی کے قیام کے سلسلے میں نساد برپا ہوا۔ اس نے بھی زیادہ تشویش تک صورت ریاست حیدر آباد نے پاکستان کو بیس کو روپے قرض دے کر سپدا کر دی۔ جو معاہدہ قائمہ کے عین خلاف تھا۔ لہذا اور بھی کئی سبزی واقعات رونما ہوئے کہ معاہدہ قائمہ منسوخ ہو گیا۔ مونٹ بیٹین اور مونکن پھر ہاتھ پیر مارنے لگے۔ مکر فضا مکر گوار ہونہ ہو سکی۔

۱۳ ستمبر کی صبح کو ہندوستان کی طرف سے فوجی کاروائی شروع ہو گئی۔  
 اور ۱۴ ستمبر کو ہندوستانی فوج چاروں طرف سے حیدر آباد اور سکندر آباد  
 میں داخل ہو گئی اور پولیس ایکشن کی تباہ کن صورت رونما ہوئی۔ پولیس  
 ایکشن کے خود و جد کی طبیعت میں ایک تغیر پیدا ہوا خود انکے اپنے الفاظ  
 میں: ”زوالِ حیدر آباد ۱۹۴۷ء کے بعد میری زندگی

صحت اور شاعری میں بڑی تبدیلی آئی۔“ ۱۵  
 یہی وجہ ہے کہ ان کا وہ سیاسی شعور جو عمر کے ساتھ ہی بڑھتا گیا  
 تھا اب اس میں ایک شہراؤں سپیدا ہو گیا۔ اب ان کی توجہ کسی اور طرف  
 مرکوز تھی جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

”مطالعے کے علاوہ میں ہندوستانی کلاسیکی رقص  
 موسیقی کا دلدادہ ہوں۔“ ۱۶

جس کے نتیجے میں رفاہ، طبیعت، پیر وین سلطانی، نغمے کی موت  
 سارنگی جیسی منظومات منظر عام پر آئیں۔ اس کی دوسری وجہ خود ان کی  
 طبیعت کی تاسا زئی تھی۔ ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح پولیس  
 ایکشن کے بعد ان کی صحت دہہ کی مودی مرض سے متاثر ہوئی اور پھر  
 ۱۷ ستمبر کو وہ ”میں اور میرا فن“ ہفت روزہ بلنر بیٹی ۱۵ جولائی ۱۹۷۷ء  
 ۱۸ ایضاً

اس یاہٹس علالت کا سلسلہ چلتا رہا جس نے کبھی شدت اختیار کی کبھی کمی اور کبھی ایسا بھی محسوس ہوا کہ وجہ صحتیاب ہو چکے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی صحت برابر متاثر رہی۔

۱۹۵۶ء میں جب لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو وجہ اور نگ آباد سے اپنے تعلق کے باعث صوبہ مہاراشٹر کے ہو گئے اور نگ آباد کی ادبی فضا جو وکی کے عہد سے ادب پر ور رہی۔۔۔ وجہ کی شاعرانہ صلاحیت کو منظور کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ اور نگ آباد کے علاوہ مہاراشٹر کے مختلف اضلاع میں رہنے اور وہاں کے ماحول سے آشنا ہونے کے باوجود وجہ کو حیدر آباد چھوٹے کاتاز لیت غم رہا۔ ان کی نظم حیدر آباد اسی دور کی تخلیق ہے۔ ان منتخب اشعار سے ان کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سہ ہرک نقش تہذیب بود نشین ہے

دل حیدر آباد اسکا امین ہے

اگر مہر و الفت کی جنت کہیں ہے

تو بیشک وہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے

نفاست برستی کدو اور ودر سے

ترسی خاک میں نکبتِ یاسیں ہے

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی رقمطراز ہیں۔

”حیدرآباد کی تقسیم کے بعد میں خود بھی کافی عرصہ

تک ایک طرح کے Nostalgia میں

جستلا رہا۔ جب اسکی شدید گرفت ہوتی تو وہ

کی نظم حیدرآباد سے مجھے کافی تسکین ملتی۔“

وہد کی ابتدائی شاعری انکے دور کی عکاس ہے جس میں آزادی

کی جہاد اور خوشگوار مستقبل کے روشن امکانات شامل ہیں۔ اسکے علاوہ

جاگیردارانہ نظام سے نفرت نئی افق کی تلاش جیسے موضوعات کو بھی

انہوں نے اپنایا۔ لیکن ان کی اس نفرت میں وہ شدت نہیں تھی۔ جو

مخدوم کے ہاں پائی جاتی ہے۔ مخدوم کی نظم ”پرانی حویلی“ اور وہد کی

ایک اور نظم کا یہ بند۔

ناقدری ہنر کی شکایت فضول ہے یاں ہر گدھے کی پیٹ پر اٹلس کی جھول ہے

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کہتے ہیں وہد کی شخصیت اور فن ”روزنامہ سیاست

حیدرآباد ۲۱ مئی ۱۹۶۷ء۔ مابد علی خان۔

کا طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد احمد سبزواری کہتے ہیں۔

” دراصل یہ اسی جاگیردارانہ ماحول پر بھرپور طعن تھا جس  
 کا تابناک سورج اپنی پوری شدت سے دکن کی سرزمین  
 پر چمک رہا تھا اور جس کی گرمی سے مقامی باشندے ہی زیادہ  
 جھاس رہے تھے۔ اور اسی کی لگائی ہوئی آگ نے وہاں ملکی  
 غیر ملکی کا سوال کھڑا کیا۔ جس میں اکثر دونوں ہی طرف کے اہل ہر  
 پسے“ لے

یہی وجہ تھی کہ مخدوم نے کھل کر بغاوت کی جبکہ وسجد بیس پر رہ ہی  
 رہے۔ اس سلسلے میں خود ان کی اپنی فطری احتیاط پسندی اور کچھ بابائے  
 اردو کی تربیت انہیں کھلنے نہیں دیتی۔ اسکے ماورائے ان کی ملازمت کی پابندیوں  
 نے بھی انہیں منہ پر عام پر آنے سے روک رکھا۔ جہاں تک ان کے دلی  
 تاثرات تھے وہ حق گوئی کی داد دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کسی  
 تحریک سے وابستہ نہ ہوتے ہوئے بھی مخدوم اور ان کے ساتھیوں کے  
 موید رہے۔ ملازمت کی بندھی ملکی مصروفیات اور قوانین کی حد بندیوں سے  
 لے محمد احمد سبزواری ”اجنٹا اور ایڈمنسٹریٹرز سکندر دہلی و سجد شاعر  
 اور شخص ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر دہلی۔

تنگ آکر وجد نے قبل از وقت ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی۔ اس کے بعد مختلف ادبی و نیم ادبی اداروں سے انکی وابستگی اور معروف ادبی شخصیات سے قربت نے ان کی شاعری کو ایک نیا رجحان عطا کیا۔ اسی کے ساتھ حکومت کے تنظیمی فرائض اور خود ان کا عمل و تحمل ان کی تخلیقی مرتبت کے سامنے حائل رہے۔ ان کی اس دور کی منظومات میں نئے رجحانات کے پہلو پہ پہلو روایت پرستی اور داخلیت کی کار فرمائی ملتی ہے۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۸ء تک راجیہ بھا کے رکن کی حیثیت سے سیاست سے وابستگی کے باعث وجد کے مزاج میں قدرے تبدیلی آئی۔ چنانچہ بعد ازاں رکنیت کے اختتام پر بھی ان کے تخلیقی کارناموں پر وہی سیاست کا تھوڑا بہت اثر محسوس ہوتا ہے ان کی نظم محمد آفرین دس سال اس کی بہترین مثال ہے ان کے بعض مغزلوں کے اشعار سے بھی یہی تاثر ملتا ہے۔

آتش مزاج وجد میں اب سرکش کہاں

وہ خاک پائے اہل نظر بن کے رہ گیا

آدائی ہند کے پہلے اور بعد میں جو جو ادبی تحریکیں رونما ہوئیں

وجد نے ان سے بہت کم ہی اثر قبول کیا۔ لیکن جدیدیت کی تحریک سے

قدرے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی آخری دور کی شاعری پر جدیدیت کی چھاپ نمایاں ہے۔ اس ضمن میں ان کی آزاد و معرّض منظومات اور ان میں اشاریت کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔ اسکے باوجود وہ تہ کے ہاں عصری حسیت کی وہ کسک نہیں ملتی جو ان کے ہم عصر اور بعد کے جدید شعراء کے ہاں پائی جاتی ہے۔ البتہ جو چیزیں ہیں وہ تہ کے کلام کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس میں پائی جانے والی شعریت اور غنائیت ہے جو انہیں اپنے دور کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

لیکن — آگے چل کر ملک کے معاشرتی و سیاسی حالات، اردو اور اقلیتوں کے حال زار اور ان کی گرتی ہوئی صحت نے وہ تہ کو خلوت نشین سا بنادیا۔ وہ یوں بھی اپنے آپ میں رہنے والے اب تو اپنے آپ کے ہو گئے یہ سچ ہے کہ وہ ترقی پسند شعراء کی طرح حالات کا اثر قبول نہیں کیا۔ ان کو اپنی شاعری کا موضوع تو اور بھی کم بنایا۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ تہ نے حالات و حوادث سے اور بے نیازی اختیار کی۔ سرکاری، سیاسی، اور سماجی حیثیتوں سے ان کو کمی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو انہوں نے جوش و خروش سے کم ہی ان کو قبول اور پورا کیا۔ ترقی اردو بورڈ، انجمن ترقی اردو، سند اور اردو اکیڈمی وغیرہ کے اجلاسوں میں

انہوں نے برائے نام شہرت کی، اور کمزور و بیشعور علالتیہانہ بنتی رہی۔ ادھر  
 کئی برسوں سے علالت ان کی زندگی کا عنوان بن گئی تھی جس نے دھیرے  
 دھیرے ان کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ بہر کیف و سجد نے  
 حالات زمانہ سے کیسا اور کتنا ہی اثر قبول کیا ہو انہوں نے اپنے دور کی  
 شاعری کو اس سے زیادہ متاثر کیا۔ اس طرح و سجد کی زندگی اور ان کی  
 شاعری کا پس منظر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔



# حالات زندگی

اورنگ آباد ! شعر و ادب کے لحاظ سے سرزمینِ دکن کا وہ  
مردم خیز خطہ ہے جس کو ابتدا ہی سے اردو کے نامور شاعروں کے وطن  
ہونے کا افتخار حاصل ہے۔

شہر اورنگ آباد تاریخ میں سب سے پہلے کھڑکی کے نام سے  
منظر عام پر آیا۔ پھر فتح نگر اور بعد میں کہیں چل کر اورنگ آباد کہلاتا ہے۔  
اکثر مورخین نے تو اسے نجستہ بنیاد رکھا ہے۔ جس سے اس شہر کی تاسیس  
کا مادہ تاریخ نکلتا ہے۔ اس شہر کو تاریخی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت حاصل  
ہے لیکن اسکی تاریخ میں کئی مدوجزر آئے۔

”کھڑکی“ مرہٹی زبان کا لفظ ہے جسکے معنی پتھر ملی زمین کے ہیں۔  
اس شہر کے اطراف و اکناف چھوٹی بڑی کثیر تعداد میں پہاڑیاں پائی جاتی  
ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اسکا نام کھڑکی رکھا گیا ہو۔ اسکے کنارے کھام ہندی

جسکو گنڈا بھی کہا جاتا ہے بہت ہی بے پہاڑیاں، وادیاں اور دریا کا کنارہ اس شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو اس شہر کی قسمت ۱۶۰۷ء میں سلطنت نظام شاہی کے جنش وزیر ملک عنبر کی قسمت کے ساتھ چکی۔ ملک عنبر اس سلطنت سے وابستہ ہونے کے ساتھ ہی اپنے اثر و اقتدار میں بتدریج اضافہ کرتا رہا اور اس نے جلد ہی ایک مضبوط اور مستحکم موقف حاصل کر لیا اور پھر چاندنی بلی کے قتل کے بعد اس نے خود مختار حیثیت حاصل کر لی۔ اسی نے کھڑکی کو اپنا دار الخلافہ بنایا اور اپنے بیٹے فتح خاں کے نام پر اس کو "فتح نگر" کے نام سے موسوم کیا۔ ملک عنبر نے فتح نگر کی ترقی و ترویج، آرائش و زیبائش، فلاح و بہبود کے کاموں میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی خصوصاً اب رسائی کا انتظام اس نے بہم پہنچایا وہ بڑا ہی عمدہ اور قابل رشک ہے

۱۶۲۶ء میں ملک عنبر کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا فتح خاں

تحت نشین ہوا لیکن نظام حکومت میں وہ ملک عنبر کا صحیح معنی میں جانشین نہیں ثابت ہو سکا۔ نتیجتاً ۱۶۲۲ء میں نظام شاہی سلطنت کے دوسرے علاقوں کے ساتھ فتح نگر بھی مغلوں کے قبضے میں چلا گیا۔

۱۶۵۳ء میں جب شہزادہ اورنگزیب کو دکن کا صوبہ داری ملی تو اس نے فتح نگر کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ چونکہ اس شہر کی آب و ہوا اور محل وقوع اورنگزیب کے مزاج کے مطابق تھے۔ اس کو یہ مقام بہت پسند آیا اور اسی مناسبت سے اس نے فتح نگر کا نام تبدیل کر کے اپنے نام پر اورنگ آباد رکھا۔

اورنگزیب کے انتقال کے ساتھ ہی ذوال سلطنت مغلیہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں نواب قمر الدین خان نظام الملک آصف جاہ اول کو اورنگ آباد کی صوبہ داری ملی۔ ملک کی انفرقاری اور حکماء کی نااہلی سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے جلد ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اپنا پایہ تخت اورنگ آباد سے حیدر آباد منتقل کر لیا۔ اورنگ آباد کی حیثیت ریاست حیدر آباد کے چوتھے صوبے مرہٹوارہ کے صدر مقام ہو گئی۔ آصف جاہ سابع کے دور میں ۱۷۶۱ء میں پولیس ایکشن کے بعد القراض حیدر آباد عمل میں آیا اور پھر ۱۷۶۷ء میں لسانی بیبادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید کے نتیجہ میں اورنگ آباد ریاست مہاراشٹر میں شامل کر دیا گیا اب اس کی حیثیت ضلع کے صدر مستقر کی رہی۔ تاریخی مقامات کی وجہ سے اورنگ آباد کی بڑی اہمیت ہے۔

ہرموسم اور ہر ماہ میں یہاں سیاح بوق در بوق آتے رہتے ہیں۔ خصوصاً  
 موسم سرما اس شہر کی گونا گوں ماحول کے لطف کو دو بالا کر دیتا ہے۔ گشت  
 نا جنوری اس شہر کی رونق کو نکھارنے والے مہینے ہیں۔ یہاں کا اندرون  
 شہر پناہ کا دروازہ جسکو بھر کل کہا جاتا ہے ہیں اپنے شاندار ماحول کی  
 یاد دلاتا ہے۔ اس سے ہوتے ہوئے شہر میں داخل ہوتے ہیں تو شہر کے  
 ایک سرے پر واقع وہ کوہستانی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو  
 اجنٹا ایلو رنگ چلا جاتا ہے اس کے قریب ہی آگرہ کے تاج محل کے  
 نمونے پر ایک چوکور عمارت مغلیہ دور کے فنِ تعمیر کی یاد تازہ کرتی ہے اسکو  
 بی بی کا مقبرہ کہا جاتا ہے جو مروجہ شہنشاہ عالمگیر کی رفیقہ عیادت  
 درس بانو بیگم (رابعہ دورانی) کی آخری خواہگاہ ہے۔ بھر کل سے  
 ایک آدھ فرلانگ دور سڑک کے کنارے واقع بھولی پارک سے متصل  
 کھام نندی گنڈام ہٹنی ہے۔ اس کے کنارے پن چکی ہے جسکا تعمیر  
 نظام الملک آصف جاہ اول کے دور میں ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ قلعہ  
 ارک اور نوکنڈہ بھی اپنی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ مقامات کے علاوہ نواح اورنگ آباد اپنی تاریخی حیثیت  
 رکھتے ہیں۔ اورنگ آباد سے کوئی اسیل کے فاصلے پر قلعہ دولت آباد

واقع ہے۔ یہ علاقہ محمد شاہ تغلق کے زمانے میں دیوگرھ کے نام سے مشہور تھا۔ فتح دیوگرھ کے بعد محمد شاہ تغلق نے یہ محسوس کیا کہ دیوگرھ ہندوستان کا سرگرم پہلو ہے لہذا اس نے اپنا پایہ تخت دہلی سے دیوگرھ منتقل کر لیا اور اس مقام کو دولت آباد کے نام سے موسوم کیا۔ بادشاہ کے ساتھ اس کے درباری اہل فن، علماء، شعراء، مورخین، رعایا کے علاوہ ہزرگان دین نے بھی دولت آباد میں سکونت اختیار کی۔ اور یہاں کی آب و ہوا سے اتنا متاثر ہوئے کہ ان میں سے بیشتر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لہذا دولت آباد سے <sup>۱۵</sup> میل کے فاصلہ پر خلد آباد میں مزید گاندین اولیاء کے کرام کے مقابلے موجود ہیں۔ جو اپنی پرشکوہ و پر جلال و جمال زندگی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ان مزارات میں حضرت شیخ برہان الدین، شیخ زین الحق، خواجہ منتخب الدین، رنخش، میر حسن دہلوی، سید زاہد پور، میر سید محمد گیسو دراز کے علاوہ اور بھی کئی موصوفی اور بزرگ ہستیاں آرام فرماتے ہیں۔ ان بزرگان دین میں اکثر حضرات سلطان اولیاء، حضرت نظام الدین محبوب اللہ کے آستانے کے چاروب کش حضرات اور ان کے مرید ہیں۔ ان کے علاوہ خلد آباد میں اور نگزیب عالم گیر کا سزار بھی واقع ہے۔ جو زبان حال سے سفلیست کی بے ثباتی کا آئینہ دار اور زندوں کیلئے ایک عبرت کدہ ہے۔

اورنگ آباد نہ صرف تاریخی حیثیت سے ہندوستان میں ممتاز

ہے بلکہ اسکی علمی فضا بھی اس کی شہرت کا باعث ہے۔ کیا شعر کیا

نغمہ، آرٹ، مصوری، سنگتراشی، نقاشی، علم و ادب، حکمت و عرفان

سچ پوچھیے تو اس سرزمین کی ہر قلمی کیفیات کو بیان کرنے کیلئے

الفاظ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وجہ کے الفاظ میں مختصر یہ ہے۔

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے

دکن کی گود میں آباد وہ خواہوں کی بتی ہے

اس سرزمین پر فنون لطیفہ کو جو نکھار حاصل ہوا، شاید کسی اور جگہ کو

موصول ہو۔ ایلورا، اجنتا کے شاہکار یہاں کی سنگ تراشی و مصوری اور یہاں

کی تہذیب و تمدن کے غماز ہیں۔ اورنگ آباد سے ۲۵ میل کے فاصلے پر

اجنتا کے غار پہاڑوں میں تراشے گئے ہیں۔ یہ غار مصوری و رنگ آمیزی

کے بہترین شاہکار ہیں۔ اور صدیوں پہلے کی ہندوستانی تہذیب اور

مصوری کے حسین نمونے بھی ان مصوروں کا نصب العین تقدس سے

بھر پور تھے اور وہ اپنے مذہب کو تصاویر کے ذریعہ مشتہر کرنا چاہتے تھے

خلوص و آفاقیت کے حسین امتزاج نے ان شاہکاروں کو لاجواب اور غیر

انحطاط پذیر بنا دیا ہے۔ ان تصاویر میں بدھ مت کا ایک دور ملتتا ہے

مذہب کی ابتداء اور عروج و زوال کو مختلف وہاروں میں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مصوروں نے نہ صرف مخلوقات کی تصاویر کھینچیں ہیں بلکہ ان میں گویا روح سی پھونک دی ہے۔ یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں مگر اہل نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتے ہیں۔

اجتنا میں عورت کے ہر روپ اور ہر پہلو کو بڑی ہی خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے۔ کہیں وہ رانی نظر آتی ہے تو کہیں رخصتہ کے روپ میں دکھائی گئی ہے۔ اور کہیں زلیخا سے لے کر کہیں عریاں و نیم عریاں لیکن یہ تصاویر جسم کی نمائش یا محض عریانی کیلئے نہیں اور نہ محض جمالیاتی حس کی تسکین یا اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ہیں۔ ان تصاویر کو بنانے کا مقصد پرستش محض ہے۔ بقول و سجد وہاں ع

تقدس کے سہارے جی رہا ذوق عریانی

ایلو را بھی فنکاری کا شاہکار ہے۔ دولت آباد سے ۸ میل کے

فاصلے پر واقع یہ مقام بھی اتنا ہی شہرت یافتہ ہے جتنا کہ اجلتا۔ ایلو را کے مندروں میں سنگتراشوں نے خاراگلازی کے بیشمار نمونے چھوڑے ہیں۔ پہاڑوں کو کھوکھلے ۳۲ مندر بنادیئے گئے ہیں۔ ان میں بدھ،

جین اور برہمن مذاہب کے بت چٹانوں اور ستونوں میں تراشے گئے ہیں۔

ان مندروں میں کیلاش کا سندراپنے فن کا بے مثال اور مایہ ناز صنم خانہ  
سمجھا جاتا ہے جس میں ہندوستانی سنگتراشی کے عجیب و غریب  
نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ خصوصاً اہر دار حرکت کو رقص کرتی ہوئی عورتوں  
جو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ صرف مشرقی آرٹ خصوصاً ہندوستان کا  
اپنا حصہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مافوق الفطرت دھار ہاتھ والے دیوی  
دیوتا مجسمے بھی تراشے گئے ہیں۔ لیکن ان مجسموں میں وہ سردہری  
جس میں جو اکثر مغربی سنگتراشی میں ملتی ہے۔ لگتا ہے یہ مجسمے نہیں زندہ چلتے  
پھرتے اور ہماری آپ کی طرح سانس لیتے افراد ہیں جو ابھی آپ سے  
گویا ہوں گے۔ ابھی آپ کا خیر مقدم کریں گے

اورنگ آباد ان فنون کے علاوہ شعر و ادب کے میدان میں بھی کبھی  
مجھے نہیں رہا۔ تصوف و عرفان کی خوشبو مہکاتے والے بزرگوں کے علاوہ  
اس سرزمین پر بابائے اردو شاعری اردو کے چار سر، ولی اورنگ آبادی  
نہ صرف پیدا ہوئے بلکہ یہیں باغ سخن کی آبیاری بھی کی۔ اس فضا  
میں سیراج اورنگ آبادی نے غزل میں تصوف و فلسفے کی چاشنی  
شامل کی۔ سیراج کے ہم عصر مرزا اود بیگ نے غزل گوئی میں ایک  
مثال قائم کی۔ عارف الدین خان عاجز، لچھی نارائین متقیق بھی



بلاشبہ علم و فضل شعر و شاعری میں اپنی مثال آپ تھے۔ اسی زمانے میں کئی شعراء شمالی ہند سے اورنگ آباد تشریف لائے۔ ان میں غلام علی آزاد بلگرامی بھی تھے۔ جو یہاں کے تشنگان علم و ادب کو سیراب کرتے رہے۔ ملا عبد القادر شاہ، غلام قادر ساقی، علم و ادب، شعر و سخن میں درس و تدریس کیا کرتے تھے۔ جہود علی صفی اورنگ آبادی کو بھی اسی خاک پر وقار سے اٹھنے کا شرف حاصل ہے۔

بیسویں صدی میں بھی اورنگ آباد کی ادبی فضا اسی طرح جگمگاتی رہی بلکہ اس پر اور نکھار آیا۔ اس دور میں ادب کے گیسو سوار نے والوں میں "بابائے اردو" مولوی عبدالحق مرحوم پیش پیش ہیں۔ انہوں نے انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل کا عہدہ قبول کرنے کے بعد طلباء کی تخلیقی قوتوں کو فروغ دینے اور ان میں انشا پر داری کے جوہر چمکانے کیلئے ۱۹۲۵ء میں رسالہ "نورس" کا اجرا کیا۔ اس کے علاوہ ایک تحقیقی سہ ماہی رسالہ "اردو" انجمن ترقی اردو کی جانب سے جاری ہوا۔ موصوف چونکہ انجمن ترقی اردو کے معتمد بھی رہے اس لئے انہوں نے انجمن کا دفتر اور مطبع اورنگ آباد منتقل کروالیا۔ موصوف کی مشہور و معروف اردو انگریزی ڈکشنری یہیں سے شائع ہوئی۔

مہی ہے وہ سیاسی معاشرتی اور ادبی پس منظر جس میں  
ضلع اورنگ آباد کے تعلقہ ویجا پور میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء کو ایک  
سید ٹیل متوسط گھرانے میں سکندر علی وجہ پیدا ہوئے۔ لے  
ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے بموجب وجد کی سن پیدائش ۱۹۱۳ء  
یہ خاندان کوئی صدی پہلے موضع سر والا سے ویجا پور آکر مقیم ہو  
گیا تھا۔ ویجا پور میں ٹیل خاندان کو اسکی علمی دوستی کی وجہ سے شرف  
امتیاز حاصل تھا۔ خصوصاً اس خاندان کو اردو فارسی شعر و ادب سے  
بڑا شغف تھا۔ خود سکندر علی کے والد سید عبدالغفور ٹیل تھے تو ایک  
آزاد منش لیکن عالم و ادب کے شیدائی۔ ان کے والدہ موتی بیگم نے بھی  
گھر بیوسور پر خاصی تعلیم حاصل کی تھی۔ عبدالغفور ٹیل حالانکہ انگریز  
سے نابلد تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے لڑکوں کو اس سے غیر مانوس نہیں  
رکھا۔ سکندر علی کو اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ عثمانیہ میں داخلے کی اجازت  
بے چوں و چرا مل گئی۔ والد مرحوم "نظم کے اس شعر سے عبدالغفور  
صاحب کی فطرت کا عکاسی ہوتی ہے۔

صفی الدین صدیقی "سکندر علی وجہ شخصیت اور فن" روزنامہ

"سیاست" حیدرآباد ۲۱ مارچ ۱۹۷۷ء

سنگم بنا ہوا تھا جدید و قدیم کا

زدہ مجسمہ تھا مذاقِ سلیم کا

سکندر علی کے بڑے بھائی سید میر ممتاز علی اور سید میر فیاض علی

بھی اردو و فارسی کے کلاسیکی ادب کے ماہر اور مجید عالم تھے۔

اور چھوٹے بھائی سید عبدالرحیم اور عبدالرشید بھی خاصا ادبی ذوق

رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنا جو ہر نمایاں نہیں کر سکے۔ وجہ

کی تین بہنیں بھی ہیں جنکے نام اقبال بیگم، حاجی بیگم اور فخر النساء ہیں

وجہ کے گھرانے میں باقاعدہ مکتب کی تعلیم کا ابھی رواج نہیں تھا۔

وجہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۷ فروری ۱۸۷۷ء بنام مریم بیگم

میں لکھتے ہیں۔

”ہمارے قبیلے (خاندان تو امیروں، وزیروں اور

مالدار لوگوں کا ہوتا ہے) میں لکھنے پڑھنے کی عادت

راج نہیں ہوئی تھی۔“

لہذا سکندر علی کو مکتب سے وابستہ ہونے کیلئے کئی دن لگے

اور کئی عمارتیں بھی بدلنے پڑیں۔ اپنے اسی مکتوب میں وجہ نے

یوں لکھا ہے۔

بد شوقی اور آوارہ گردی سے اسکول سے دو تین

مہینے میں میرا نام خارج ہو جاتا تھا۔

اس کے نتیجے میں وہ قصبے کے مدارس کے علاوہ اطراف واکنا  
کے مدارس سے بھی وابستہ ہوتے رہے۔ بچپن میں وہ مجموعہ اضرار  
پٹے ہوئے تھے۔ نارغ البالی اور آسودہ حالی تو میسر تھی ہی چنانچہ  
نثرارت اور شوخی بھی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود  
انکی سنجیدہ طبیعت اور ذہین و متین شخصیت نے انہیں اساتذہ  
کا عزیز و رشید بنا رکھا تھا۔

قد آور، چھریرا بدن، گورا رنگ، ادنیٰ اور سجیلی ناک، شمر و  
نغمہ سے سرشار آنکھیں۔ ان پر شمار ہونے والے ابرو کالے رنگ کا  
پشمہ جس کا فریم بھی قدر و قامت کی مناسبت سے موزوں ہوتا  
چہرہ صاف و شفاف مثل آئینہ جمے جلے بال جو سر کے صرف  
پچھلے حصے پر نظر آتے۔ دوہرا یا جامہ کرتا پہنتے صاف اور شفاف  
اور اس پر مکلف شیر وانی دیدہ زیب ہنس۔ دلفریب ہرمانیہ  
شخصیت! انتہائی محتاط مخصوص سلیقہ، رکھ رکھاؤ و طور طریقوں  
اور ادب و آداب کے علمبردار، مختلف مدارس سے وابستہ ہوتے ہوئے

وہ جالانہ کے مدرسہ فوٹانیہ سے منسلک ہو گئے۔ اور پری  
 میٹرک جالانہ ہائی اسکول ہی سے کامیاب کرنے کے بعد ان میں  
 تعلیم کا صحیح ذوق پیدا ہوا جو انہیں اورنگ آباد لے گیا۔ ان دنوں  
 سکندری اسکول اتنے عام نہیں تھے۔ میٹرک لکیشن کے لئے طلباء کو  
 لیے لیے سفر طے کرنے پڑتے تھے۔ اورنگ آباد جانے کے بعد ہی  
 انکی ذہنی اپ بھگت کا باب شروع ہوتا ہے۔ انہیں اورنگ آباد کی  
 فضا بہت پسند آئی اور وہاں کا ماحول بڑا عزیز ہو گیا اورنگ آباد  
 کے تاریخی و شعر پرور ماحول نے ان کی طبیعت میں انگارے گھولا کہ  
 سہارے کے آتے آتے ان کا پیما نہ فکر لبیر نہ ہو گیا۔ اور اشعار گویا  
 آپ ہی آپ ڈھلنے لگے۔ ابتدا بقول کا مرید کلیم اللہ صدیقی اورنگ آباد کے  
 مشاعروں میں مترنم آواز میں وہ بڑے فطرتی تخلص کے ساتھ حصہ  
 لینا شروع کیا۔ ان کا وہ بڑا اور مترنم لہجہ رد لکش و جادو بھری آواز  
 نے مولانا عبدالباق کو کب حیدر آبادی کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے سکندری  
 کو فطرتی کے بجائے وہ تخلص اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ بڑے  
 اپنے کلام کی جن اساتذہ سے اصلاح لی ان میں سید محمود مغربی  
 اورنگ آبادی، سید غلام ربانی دہلوی اور سید و باج الدین شمیم

لکھنوی کے نام یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ وسجد کی شہرت  
کا آغاز ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

وائے دریدہ دامن گل جو چنے تھے گر گئے  
خار ہا خار رہ گئے دامن تار تار میں۔

اس کے باوجود اس کل ہند مشاعرے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا  
جو انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام مہاراجہ کرشن پرشاد شاد کی صدارت  
میں بی بی کے مقبرے میں ہوا تھا۔ اس کا انتظام کالج کے پرنسپل  
اور انجمن ترقی اردو کے محترم مولوی عبدالحق کی نگہداری میں تھا۔  
وسجد اس وقت میٹرک کے طالب علم تھے۔ مولوی عبدالحق  
چاہتے تھے کہ اس نوخیز ستارے کو بھی سپہر سخن سے آشنا  
کرایا جائے۔ انہوں نے وسجد کو تاکید کی کہ وہ بھی اس مشاعرے  
میں حصہ لیں۔ طالب علمی و نا تجربہ کاری کی وجہ سے وسجد ششما  
پنج میں مبتلا ہو گئے۔ آخر بہت کر کے اسٹیج پر آئے اور اپنی مشہور  
غزل مترنم لہجے میں سناتے گئے۔ جس کے چند شعر یہ ہیں۔

رو تے رو تے آنکھ میں آنسو کی بوند  
گو صبرِ نایاب بن کر رہ گئی

اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے  
 ہر تمنّا خواب بن کر رہ گئی  
 و جد کیا معلوم کیا بنتی وہ شے  
 جو شرابِ ناب بن کر رہ گئی

صدر مشاعرہ مہاراجہ کرشن پرشار شاد صدر اعظم دولت  
 آصفیہ کو اس غزل کی انوکھی ادا اور غزلِ خواں کا مترنم ہلجہ  
 بڑا ہی دلکش معلوم ہوا۔ انہوں نے ہر شعر پر ایک ایک  
 اشرفی عطا فرمائی۔ اس بر وقت ہمت افزائی و سرفرازی  
 کا وجد کے حوصلوں کو بلند کرنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا  
 کرنے میں بڑا ہاتھ ہے۔

مولوی عبدالحق کو وجد پر بڑا ناز تھا۔ وہ انھیں بے حد  
 چاہتے اور قریب رکھتے تھے۔ جب وجد میٹرکلیشن میں کامیاب  
 ہوئے تو انہوں نے اسی کالج میں داخلہ لیا جسکے پرنسپل مولوی  
 عبدالحق صاحب تھے۔ مولوی صاحب کی جو ہر شناس نظر نے  
 نہ صرف وجد کے مضمون ہوا ہر کو نمایاں کیا بلکہ انھیں اور نکھارا  
 ۱۹۱۷ء میں انہوں نے انھیں انٹر میڈیٹ کالج اورنگ آباد کے

میگن "نورس" کا ایڈیٹر منتخب کیا۔ اس کا انھیں کما حقہ علم تھا کہ یہ صدف برابر موتی لٹائے رہے گا۔ ہر سال تک مولوی صاحب کی قربت نے وسجد کی ترقی میں چار چاند لگائے۔ جب وہ انٹر میڈیٹ کے بعد لڈالہ کی ڈگری حاصل کرنے کیلئے جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے۔ تب بھی مولوی صاحب کا ساتھ رہا۔ استاد محترم کا شاگرد رشید کے داخلے سے پہلے ہی جامعہ میں بحیثیت استاد شعبہ اردو میں تقرر ہو چکا تھا اب اکثر اوقات مولوی صاحب کے دیوان خانے میں ان کی نشست ہوا کرتی جہیں کئی ادبی و فنی ادبی پہلوؤں پر بحث ہوا کرتی۔ اکثر چہل قدمی کے وقت وہ مولوی صاحب کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس کے باوجود وسجد نے عبدالحق کے پاس وہ مقام حاصل نہیں کیا جو شیخ چاند نے حاصل کیا تھا۔ اس کا سبب عبدالحق صاحب اور وسجد کے مزاج و مہاج کا فرق تھا۔ وسجد شاعر تھے اور عبدالحق محقق۔ اس کے برخلاف شیخ چاند عبدالحق صاحب کی طرح تحقیق کے مرد میدان تھے۔ لہذا شیخ چاند محقق و منتظم عبدالحق صاحب



دستِ راست بنے رہے۔ اسکے باوجود مولوی عبدالحق صاحب کا یہی منشا تھا کہ وسجد انجمن ترقی اردو کے ہمہ وقتی کارکن بن جائیں۔ لیکن ایک وسیع کینے کی کفالت کا ذمہ و سجد کو مولوی عبدالحق اور خود انکی اپنی خواہش کو ترک کرنے کا باعث ہوا۔ و سجد اور مولوی صاحب کے گھاؤ کا اندازہ یہیں پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

”اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب نے کئی کتابیں

لکھیں لیکن و سجد کی ذات میں انہوں نے جو پیش لفظ

کو ترتیب دیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔“

و سجد نے عبدالحق کی قربت سے ہمہ جہت استفادہ کیا

مولوی صاحب کی تحریر کی نقل کرنے میں اپنے فن کو اتنا چمکایا

کہ بیک وقت دونوں کی تحریر مشابہ ہوتی تھی۔ ایسا بھی

ہوا کہ کبھی کبھی مولوی صاحب کی فرمائش پر یا پھر کبھی خود

اپنی طرف سے لوگوں کو مولوی صاحب کے سفارشی مراسلے

”پروفیسر رفیعہ سلطانہ“ فن اور فنکار“ مجلس تحقیقات اردو

لکھ دیا کرتے تھے۔ مراسلہ الیہ کو اسکا مطلق پتہ نہ چلتا۔ اور  
 مولوی صاحب کو اس وقت پتہ چلتا جب لوگ اپنا کام ہونے  
 کے بعد شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کے پاس آتے۔  
 جس زمانے میں وہجد نے جامعہ عثمانیہ میں قدم رکھا اسوقت  
 جامعہ کا پہلا دور رخصت ہو رہا تھا اور دوسرے دور کے آنے  
 کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ پرنسپل کا عہدہ درخواست  
 ہو چکا تھا۔ اور اسکی جگہ وائس چانسلر کا تقرر ہونے والا تھا  
 کلج کو یونیورسٹی سے موسوم کیا جا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی جامعہ  
 اڈیکمیٹ میں منتقل ہونے والی تھی۔ مخدوم ساز سہتیں اور  
 میکش مطلع سخن پر طلوع ہو چکے تھے۔ ان کی نغمہ سنجیوں  
 سے حریم جامعہ گونج رہی تھی۔ بلاشبہ اورنگ آباد کی فضا  
 وہجد کو سپہر سخن سے روشناس کروایا تھا۔ لیکن جامعہ  
 عثمانیہ کی پرلطف فضا نے انھیں سپہر شعر و ادب پر ایک  
 منفرد مقام تک پہنچا دیا تھا۔ جہاں انکے ہم عصر پر بھی نہیں  
 مار سکتے۔ انکی وضع ہی شعرائے جامعہ سے مختلف تھی  
 بقول جیلانی بانو۔

نہ سب شاعروں میں کوئی چہرہ الگ پہچانا سیتا  
 تھا۔ تو وہ وہ صاحب تھے۔ سفید کلف لگے  
 بے داغ کپڑوں میں جگر گمر کرتے ہوئے وہ  
 صاحب جنہیں دیکھ کر خیال آتا کہ یہ کوئی شاعر  
 نہیں فرشتہ ہیں۔ لے

ان کا سلیقہ رکھ رکھاؤ اور آداب ہی منفرد تھے۔ سید  
 منکسر المزاج ویسے چہرے سے رعب داب بزرگی و شرافت  
 جھلک جھلک پڑتے تھے۔ انہیں ہر لحظہ اپنی ریشمی شیریوانی  
 کے بن امد کار کا خیال رہتا تھا۔ کیا مجال جو ان کی شیریوانی  
 پر کسی قسم کا داغ دھبہ نظر آجائے۔ یوں منکسر المزاجی کے بارے  
 میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی سا دھبہ نہ دیتا تھا۔ انہوں نے  
 جو وہ کہا ہے۔

خاکساری کو چھپانے کیلئے وہ مغیرہ نظر آتا ہے  
 بالکل ٹھیک ہے۔ ظاہر داری کی قربا اس وقت دھبہ لگتی

ہے جیلانی بانو آج کی طرف دیکھو روزِ قلم منصف تعمیر آباد

اور ان کی اصلیت متز شح ہوتی۔ جب وہ شعر سنا کے کیلئے  
 شہ نشین پر آتے۔ شعر کا ہے کو سنا تے وہ تو ہم تن  
 شعر بن جاتے۔ یہی سپردگی ان کی شہرت کا راز اور ان کے  
 اشعار کی مقبولیت کا جواز تھی۔ ان کی آواز صرف آواز ہی  
 نہیں بلکہ نغمہ تھی جو صرف وہاں اور ہی نہیں بلکہ اپنے اندر  
 پیغمبرانہ لہجہ لئے ہوئے ہوتی ہے۔

حریفِ نغمہ ہے اندازِ گفت گو میرا

ازل سے فطرتِ چنگ و رباب لایا ہوں

بقولِ وحید اختر :

ان کا ترنم یگانہ کے ایامِ جوانی کے ترنم  
 سے بہت مشابہ تھا ان کے یہاں یگانہ کی  
 بے دماختی و بے نیازی بھی ملتی ہے لیکن  
 اتانیت اور دنیا سے بیگانگی نہیں۔۔۔

۱۹۲۵ء میں دہلی کے جامعہ عثمانیہ سے بی اے اول درجے

میں کامیاب کیلے اردو اور فارسی میں جامعہ میں اول آنے پر

لے وحید اختر و جد شاعر و شخصیت (۱۹۸۵ء)

انھیں وظیفہ امتیاز عطا کیا گیا۔ بی اے کی کامیابی کے ساتھ ہی انہوں نے ایم اے سال اول میں داخلہ لیا۔ اقبال سے دلچسپی نے انھیں کلام اقبال پر تحقیق مضمون لکھنے پر آمادہ کیا۔ جو بال جبریل پر تنقیدی حیثیت رکھتا ہے اور مجلہ عثمانیہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اقبال پر مزید تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں اقبال سے خط و کتابت بھی کی تھی لیکن بڑھتی ہوئی گھبراہٹ و ذمہ داریوں اور سبب سے سمجھتی ہوئی زمینداری نے انھیں حیدرآباد سول سروس کے مسابقتی امتحان میں شرکت پر مجبور کیا۔ وحید کو وراثت میں ایک بڑا کنبہ اور ایک مرصع تلوار ملی تھی۔

وحید نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں نہ صرف اشعار کہے بلکہ کئی ایک انشائیہ تبصرے اور تحقیقی مضامین بھی لکھے۔ "حیدرآباد سے بمبئی تک" ایک سفر نامہ ہے جو تین دن کی بمبئی کی پکنک کے دوران تحریر کیا گیا تھا بال جبریل، راز مسرت، اور اقبال کی غزلیں ان کے

تحقیقی مضامین میں "No Display" بھی دی کا ایک  
 دلچسپ اور لطیف حصوں ہے جو نوڈلانی انگلیزی میں لکھا  
 ہے۔ ان حصوں میں اپنے ایک ہم جماعت دوست کا مکمل اڑا لیا  
 ہے۔ جو چار درجہ احساسی برتری کا شکار تھے۔

وہد کی تعلیمی صلاحیت سے متاثر ہو کر ۱۹۳۶ء میں انھیں  
 جامعہ عثمانیہ کے سہ ماہی رسالہ "مجلہ عثمانیہ" کا مدیر منتخب کیا  
 گیا۔ وہد نے اپنی علمی صلاحیت کے باعث ایچ۔ سی۔ ایس  
 کے مسابقتی امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ دریں اثناء سر الکبیر دہری  
 صدر اعظم دولت اصفیہ کو وہد کی نظم "تاج محل" بہت پسند  
 آئی۔ انہوں نے وہد سے اجتناکے غلوں پر بھی ایک نظم  
 لکھنے کی فرمائش کی اور تنخواہ کے ساتھ ایک سال کی رخصت  
 عطا کی۔ ان ہی دنوں وہد نے اسٹیٹ ہوٹل اورنگ آباد اور  
 اجتا کے گسٹ ہاؤز میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے قیام  
 کیا تھا۔ ایچ۔ سی۔ ایس کے امتحان میں منتخب ہونے کے بعد  
 انھوں نے تعلیم ترک کر دی۔ ہر سولہ ماہ کو منتخب ہونے کے  
 بعد تین سال تک ترقیتی مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔

پہلے سول سروس ہاؤز میں بسر ہوتا تھا اور  
 ٹریننگ کلاس میں چھ بجے سے شام کے آٹھ بجے تک  
 مسلسل ہوتی رہتی تھیں سال کے اختتام پر انھیں امتحان  
 دینا ہوتا تھا۔ دوسرے سال ریاست حیدرآباد کے تمام  
 شعبہ جات میں علی تربیت ہوتی تھیں اور شام متعلقہ  
 محکمہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے بعد پیرو پیشتر (Pirou)  
 (battrons) کو مختلف محکموں کے لئے منتخب کیا جاتا تھا  
 جن میں مسال Finance آرٹس ایڈر اکاؤنٹس پولیس  
 عدالت اور محکمہ پٹہ شامل تھے اور ہر پیرو پیشتر کو برطانوی  
 ہند کے کس صوبے میں مزید ٹریننگ کیلئے بھیجا جاتا تھا  
 اور تقرر کیلئے وہاں سال کے اختتام پر امتحان میں کامیابی  
 لازمی تھی۔ سکندر علی وہید کو عدالتی شعبہ کیلئے منتخب  
 کیا گیا اور ۱۹۳۷ء میں عدالتی ٹریننگ کے سلسلہ میں وہ  
 سینٹاپور (اودھ) (رضویہ متحدہ) روانہ ہوئے۔ یہ ٹریننگ  
 ۱۹۴۰ء تک رہی۔ اس عرصہ میں وہاں انکی ملاقات اردو کے  
 نامور شاعر جعفر علی خاں اثر لکھنؤ سے ہوئی۔ اب وہید کے

تھیں و تھکر میں ایک نیا عصر شمال ہو گیا۔ وہ فن جس پر  
 اورنگ آباد اور حیدرآباد کی چھاپ تھی اب لکھنؤ کے رنگ  
 سے بھی مانوس ہو گیا۔ اور اب انکی شاعری نہ صرف دکن  
 بلکہ شمال خصوصاً لکھنؤ وغیرہ میں مشاعروں کے ذریعہ  
 معروف ہو چکی تھی۔ حیدرآباد کو وجہ کی فرقت کب  
 گوارا تھی گو کہ ان کے ہم عصر یہاں موجود تھے۔ عبدالحی اکیدینی  
 حیدرآباد دکن نے اس فرقت کو ایک حد تک دور کر کے  
 کیلئے اپریل ۱۹۵۷ء میں وجہ کے کلام کا پہلا مجموعہ  
 ہو نرنگ شائع کیا۔ جس میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کا  
 منتخب کلام شامل ہے۔ اس مجموعے میں کل ۶۰ منظومات  
 اور ۳۷ غزلیات بڑے ہی سلیقے سے ترتیب دئے  
 گئے ہیں۔ وجہ نے اس کا منظوم دیباچہ جنوری ۱۹۵۷ء  
 میں مرقوم کیا تھا جو مسدس کی شکل میں سات ترکیب  
 بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کی خصوصیت خود  
 اس کے نام سے مترشح ہے۔ لفظ "ہو نرنگ" دراصل  
 اقبال کے ایک قطعہ سے لیا گیا ہے۔



ق و جیتک نہ زندگی کے سقاؤں پہ ہو نظر  
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

یہ زور دست ضربتِ کاری کا ہے مقام  
میدانِ جنگ میں نہ طلب کرے نوائے جنگ

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات  
فطرت "ہو ترنگ" ہے قائل نہ "جل ترنگ"

اس مجموعہ کے دیباچے اور اس کے پیش کردہ قطعے سے یہی نتیجہ  
اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وسعہ ابتداء میں انیس اور اقبال سے  
متاثر رہے۔

شعبۂ عدلیہ سے منسلک ہونے کے بعد انہوں نے اپنے  
آپکو ممکنہ حد تک کم امینر بنالیا تھا۔ جب کوئی ان سے شعر  
سنائے کی فرمائش کرتا تو متحیر نظروں سے اسکو دیکھتے۔ اس  
زمانہ میں بھی اگر وہ کسی شخص کو شعر سناتے تھے تو وہ صرف  
ان کے ایک دوست اشفاق حسین مرحوم تھے۔ یوسف ظلم  
اپنے ایک مزاحیہ مضمون "کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا  
کہتے ہیں" میں لکھتے ہیں۔

صرف وہ سرور اکبر اشفاق حسین تھے جسے

وہ صاحب اصرار کر کے اپنا کلام سناتے اور

اسکی معقول قیمت ادا کرتے تھے۔" لہ

اشفاق حسین وہد کے قریب ترین ساتھی رہے۔

یقول ڈاکٹر مجید بیار وہد:

"اشفاق صاحب کا ذکر بہت ہی والہانہ وابستگی

مکے ساتھ کرتے تھے۔" لہ

ونیز وہد اپنے کلام پر صرف اشفاق حسین کی رائے کو ضروری

سمجھتے تھے۔ نور لکھتے ہیں۔

میرے دوست سید اشفاق حسین مرحوم اردو

ادب کے ایک دیدہ ور نقاد تھے۔ حسب طرح غالب

مصطفیٰ خاں شحیفہ کی پسند کے بغیر اپنی غزل

دیوان میں نہیں لکھتے تھے۔ اسی طرح میں بھی

لہ یوسف ناظم کہتے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ ماہنامہ کتابنا

پیش ۸۲ء

مجید بیار حضرت وہد کی زندگی کا آخری دور ۲۳ مئی ۱۹۸۳ء بروز نامہ

مصحف "حیدر آباد۔"

اشفاق کے مشورے کو اہم سمجھتا تھا۔ ۱۷

ایام طالب علمی میں ان کا کمرہ بقول اشفاق حبیبی مرحوم۔

سماع خانہ تھا۔ اسی سلسلے میں مرزا ظفر الحسن لکھتے ہیں:

”وہ ہمیشہ کا خوش الحان تھا۔ اشفاق نے

اس کے کمرے کا نام سماع خانہ رکھا۔ ۱۸

وہ اگرچہ سنجیدہ مزاج تھے پھر بھی حاضر جوابی برجستہ گوئی

اور ہنسنے کی سبھی ان کے اوصاف میں شامل تھے۔ مزاج کا

شگفتہ بین ہر شخص میں ایک دل خوش ماحول پیدا کرنے کیلئے

کافی تھا۔ ۱۹

رونقِ محفل احباب ہے یہ مردِ نحیف!!

سخت پیے پاک جنوں کیشِ خدا ترسِ ظریف

وہ نے اپنی زندگی کو بڑا محنتاً بجا رکھا تھا۔ خط و کتابت

کے سلسلے میں وہ بالکل کمزور تھے۔ جہاں تک باقاعدہ

۱۷ سکندر علی وہ سلیا جمال اجتناباً ہمالہ دیباچہ سکندر علی وہ زیرِ طبع۔

۱۸ مرزا ظفر الحسن ”ذکرِ یارِ چلے“ حامی بکدلو محصلی کمان حیدر آباد

خط و کتابت کا تعلق تھا وہ بلگرامیوں کے علاوہ کسی اور سے زیادہ نہیں رہا۔ بے حساب خطوط آئے لیکن کسی کا جواب دینا انھیں پسند نہیں تھا۔ راقم الحروف نے خود اپنی تحقیق کے سلسلے میں کئی خطوط لکھے۔ لیکن وجہ لے جیسا کہ ان کا مزاج تھا جواب کا مستحق نہیں سمجھا۔ اس باب میں ہم ایک ہی نہیں خود ان کے عزیز واقارب بھی آجاتے ہیں ڈاکٹر مجید بیدار کے یہ سطور وجہ کی شخصیت کے اس پہلو پر کافی روشنی ڈالتے ہیں :

بے حساب خطوط آتے لیکن کبھی کسی کا جواب تک نہ دیتے تھے۔ اگر از حد ضرورت ہوتی تو ایک پوسٹ کارڈ پر چند جملے تحریر کئے اور مقصد بیان کر دیا چنانچہ ایک دفعہ انھیں علامہ اقبال کے ایک غیر مطبوعہ خط کی ضرورت تھی جو حبیبیس شرف الدین کے پاس محفوظ تھا۔ مجھے پوسٹ کارڈ پر چند سطور لکھ کر وہ خط لانے کی تاکید کی۔ مسٹر سلطانہ شرف الدین سے ملاقات پر انہوں نے وجہ صاحب کا

احتراماً ذکر کرتے ہوئے اظہار خیال کیا کہ وسجدہ توحید  
 لکھتے ہی نہیں۔ بھلا ایک کسان پیشہ سے تعلق  
 رکھنے والے کو لکھنے پڑھنے سے کیا تعلق ہے۔  
 لیکن انکی وضعداری تو ماشاء اللہ بقول جیلانی بانو :  
 " وسجدہ صاحب ہمیشہ اندھیرے میں اجلی کرین کی  
 طرح سنایاں نظر آتے تھے "۔

سکندر علی وسجدہ کے ایک دوست مرزا ظفر الحسن وسجدہ  
 کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :  
 " افسر کی انا سکندر میں طالب علمی کے زمانے  
 سے تھے۔ اس پوت کے پاؤں مجھے پالنے میں  
 میں اسی دن سے نظر آنے لگے جبکہ وہ اور میں عارضی  
 اقامت خانے میں ایک ساتھ بیٹھ کر انگریزی تشریاد  
 کرتے تھے میں اگر اسے صحیح مفہوم بھی بتاتا اور وہ  
 لے ڈاکٹر مجید بیدار غزل کی آبرو حضرت وسجدہ کی زندگی کا آخری دور روزنامہ

منصف ۲۲ مئی ۱۹۸۳ء حیدرآباد۔

نہ جیلانی بانو آج کی طرف دیکھو روزنامہ منصف ۲۲ مئی ۱۹۸۴ء حیدرآباد۔

اسے غلط سمجھتا یا پسند نہ کرتا تو مجھے ڈانٹ

دیتا اور کہتا تھا۔ گڈو تو نے یہ مطلب کسی

اینگلو انڈین دوست سے سنا ہو سکا یا درکھنا

اس چھوکری پر نظم لکھ دوں گا۔ اس نے

بہت کم ساتھیوں کو منہ لگایا۔ لے

مرزا ظفر الحسن کے الفاظ اور لفظ گڈو کے استعمال سے

ہمیں وجہ کی شخصیت اور طبیعت کی افتاد کا اندازہ ہو جاتا

ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ پسیت تد کو دکنی

میں گڈو اکہا جاتا ہے اور اس مناسبت سے انہیں گڈو کہنا

اور پھر ان کے صحیح مطلب بیان کرنے پر بھی انا قائم رکھتے

ہوئے یہ کہنا کہ "یادرکھنا اس چھوکری پر نظم لکھ دوں گا"

بڑا ہی پر لطف انداز معلوم ہوتا ہے۔ ظفر الحسن نے

وجہ کی گالیوں کو بھی کلف دار کہا ہے اور آگے چل کر

لکھتے ہیں :

مرزا ظفر الحسن "ذکر یار چلے" حامی بکد پو حیدر آماد۔

۱۹۰۹ء پہلی اشاعت۔



سانے دھری کی دھری رہ جاتی تھی۔

وہ عالم جوانی میں بھی صحت و تندرستی کی طرف سے

غیر مطمئن سے رہے اور اپنی صحت کے تعلق سے ہمیشہ  
وہوں کا شکار وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔ اقداس سے زیادہ  
بیماری کے بارے میں متوشش انکی وضع قطع ہی منفرد  
اور انوکھی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر ان کی بیماری سے اکثر اور بیشتر  
ان کی خود پسندی سے خائف رہتے تھے۔ بسا اوقات تو  
ڈاکٹروں کو مرض کی تشخیص ہی میں کافی پریشانی ہوتی تھی  
اکثر کہتے تھے۔ وہ صاحب آپکی بیماری بھی نظم کی طرح  
انوکھی ہوتی ہے۔ اور پھر ان کو دوا کھانے کے پسند کی دینی  
پڑتی تھی۔ یوسف ناظم اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں :  
"وہ صاحب دواؤں کا انتخاب بھی اپنی پسند  
سے فرماتے ہیں۔"

وہ اپنی ساری یافت صرف دواؤں اور کتابوں میں  
صرف کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن وہ کتابوں کو اکھٹا  
لے یوسف ناظم کہتے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں۔ ماہنامہ کتاب نما  
بجلی مارچ ۱۹۲۱ء



کرنے کے عادی نہیں تھے۔ بلکہ اس کے صحیح تصرف کیلئے  
 کسی دوست کو تحفہ دے دیا کرتے تھے۔ ونیز سواری پر  
 یا تقاریب پر بھی وہ روپیہ صرف ہی نہیں کرتے تھے۔  
 سواری کیلئے بڑی مشکل سے ایک کار خریدی تھی لیکن  
 ان کی خود رومی اور انانیت پسندی کی زد میں ہر شو فرک  
 انا کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ نتیجتاً چند ہی دنوں میں کئی شو فرول  
 کو بدلنا پڑا لیکن ایک دیدہ ور شو فر نے ان کی سواری ہی بدل کر  
 ان کی انانیت پسندی کو برقرار رکھا کیونکہ ایسا نہ ہوتا تو یا کوئی  
 حادثے کا خدشہ تھا یا پھر ان کی ناگواری کا اندیشہ چنانچہ  
 وجہ نے پیدل چلنا ہی مناسب سمجھ رکھا تھا۔ ان کی کم آہیزی  
 کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے ایک رفیق اشفاق حسین تحریر  
 کرتے ہیں،

یوں قوم میں نے لوگوں سے وجہ کی تہذیب و  
 شرافت کی تعریف ہی سنی لیکن اسکی کم آہیزی  
 بے نیاز، اور بے التفاتی کو ناواقف لوگ  
 غور اور مردم بیناری سے تعبیر کرتے ہیں

ملا کہ یہ تعبیر بالکل غلط ہے :۔

۵ وسعت حلقہ یاراں اسے منظور نہیں

یہ حقیقت میں کچھ کمیز ہے مضرور نہیں

پہلی دوسری ملاقات کے بعد ہر ناواقف کیا واقف

آوی کی بھی یہی رائے ہو سکتی تھی۔ لیکن وجد مردم شناس

تھے بعض لوگوں کو انہوں نے ان کے پنہاں امکانات کی

بنا پر یا پھر ان کی طبیعت کی اعتقاد کی بنا پر اپنے سے

زیادہ دور رکھنا گوارا نہیں کیا۔ میں شاکر وجد کی شرافت

طبع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں :

۶ وہ اپنی عمر سے چھوٹے افراد کی بھی بے حد

عزت اور قدر کرتے تھے۔ بغير صرف یہ تھی

کہ وہ اپنے فن میں پختہ ہوں وجد صاحب ان

سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کی بڑی

خاطر خواہی تھی کہ نئے۔ مگر ملاقات کی دانا

۷ اشفاق بیاض مریم : سونیر حش و وجد اور نگ آباد

تک نہ ہوتی تو خود اپنے گھر جاتے تے۔ ۱۰

پہلے ترنگ کی اشاعت کے بعد ان کی علمی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ عدالتی شرینگ کے بعد منتظی کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ ان مصروفیات کو پیش نظر رکھ کر اگر کوئی ادنیٰ ذوق شاعر ہوتا تو شاعری سے منہ پھیر لیتا لیکن وہ سجدہ کا ذوق چونکہ حقیقی تھا اسلئے وہ ان دونوں شعبوں میں آگے بڑھتے رہے۔ ۱۱

دن بھر تو وہ سرگرم علمی نظم کار تھیں

انصاف کتاں عدل کے ایوان میں ملے گا

اکثر شب مہتاب میں وہ شاعر فطرت

سرگرم سخن بزم سخداں میں ملے گا

وہ کی شاعری سے اردو دنیا یوں بھی واقف تھی۔

لیکن ۱۹۵۹ء میں غلام بیروانی ناظم آثار قدسیہ جو فرحت اللہ

بیگ کے رفیق غزیر تھے۔ انہوں نے ایک مضمون انگریزی

میں "MODERN URDU POETS OF HYDERABAD" حیدرآباد

۱۲ معین شاکر و جد شاعر و شاعر مکتبہ جامعہ لکھنؤ

بہدینہ شعرائے اردو لکھا۔ اس مضمون میں فضل الرحمن ۸۲  
 سکندر علی وحید، میکش اور مخدوم محی الدین کی شاعری کا تعارف  
 و ترجمہ مع حالات زندگی شامل ہے یہ مقالہ رسالہ "اسلامک  
 کلچر" جنوری ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہی وہ پہلا مقالہ تھا  
 جس کے ذریعہ وحید کی شاعری غیر اردو داں طبقہ سے  
 متعارف ہوئی۔ اس مقالہ میں وحید کی منظومات اور نثریاد  
 اجتناف نریں اور میکدہ کا ترجمہ اور ان کے اندر پائے  
 جانے والے فلسفیانہ نکات کو نمایاں طور پر انگریزی  
 میں پیش کیا گیا ہے۔

وحید کا شہرہ اسی زمانے میں دور دور تک پہنچ  
 چکا تھا۔ جبکہ وہ طالب علم تھے۔ مخدوم نے بھی اپنی  
 طالب علمی کے زمانے میں شہرت پائی لیکن یہ شہرت  
 انھیں وحید کی شہرت کے بعد نصیب ہوئی۔ وحید اسلاف  
 واساندہ کا احترام کرتے ہوئے مقبول ہوئے لیکن  
 مخدوم اسلاف کی روایات سے منحرف تھے ۱۹۷۷ء  
 سے ۱۹۷۹ء تک وحید کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ۔

۸۳ حسن کا عالم جھوٹے لگتا تھا۔ وجہ منتفی کی تردیدیں

ٹرینگ پوری کر لینے کے بعد حیدر آباد ہائی کورٹ میں رجسٹرار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ان کی شکلیں و صدارت شخصیت انکی علمی استطاعت اور بحیثیت شاعر ان کی مقبولیت دیکھ کر حیدر آباد اور اورنگ آباد کے متعدد محترم خاندانوں کی خواہش تھی کہ وجہ ان ہی کے خاندان کے فرد بن جائیں لیکن وجہ نے ۱۹ جولائی

۱۹۴۷ء کو اپنے ہی ایک عزیز سید فیاض علی انصاری اور نوربانو (جو بمبئی میں مقیم تھے) کی دیوہری صاحبزادی زبیدہ خاتون سے بیاہ رچا کر یہ ثابت کر دیا کہ وجہ حیدر آباد یا اورنگ آباد کے کسی ایک خاندان میں داخل ہو کر دوسرے خاندان کو رنجیدہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان کا مسلک اپنے قدر دانوں کو شریک عیش کرنا تھا اس سلسلے میں ان کے مزاج کی کتبہ پروری کی روایت کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔

وجہ ایک باجوصلہ مرد، بلند اخلاق فرد، سنجیدہ طبع

سوسائٹی کے محترم سناٹے رفقوں کے رفیق اور قدردانوں<sup>۸۴</sup>  
کے شفیق تھے۔

سنا ہے وجہ ہے اچھا ستھور

کوئی کہتا ہے اچھا آدمی ہے

کسی ہمارے موقع پر فی البدیہہ شعر کہہ دینا ان کے لئے مرکوی  
خاص بات نہیں تھی ۱۹۶۷ء کے بعد کی بات ہے جبکہ  
وجہ کنٹر میں منصف کے عہدے پر ناٹس تھے۔ ان ہی  
دنوں ویجا پور سے کنٹر واپس ہو رہے تھے ان کا گذر  
اورنگ آباد سے ہوا۔ اسی موقع پر خواجہ منتخب الدین  
زر زری بخش کا صر س شریف تھا۔ جب انھیں راستے  
میں اسکا پتہ چلا تو انہوں نے اپنا سفر ملتوی کر کے وہاں  
قیام کیا اور ایک پر عقیدت ریاضی کہی

۷۔ اے صاحب الطاف و کرم حضرت زری بخشؒ

میری شہید تاریک کو اوار سہر بخش

دنیا میں جو نایاب ہے وہ چیز عطا کر

زر کی مجھے کچھ نکر نہیں ذوقِ نظر بخش

اسکے علاوہ نظم "مزدوروں کا پیغام" بھی اسی طرح  
 کمرٹس کالج کے معاروں کو عمارت کی تکمیل کے بعد  
 واپس جاتے دیکھ کر بی البدیعہ کہی گئی تھی۔  
 لسانی بنیادوں پر مہیاستوں کی تنظیم جدید سے  
 پہلے وجہ آندھرا کے بورڈ آف سکندری ایجوکیشن کے  
 ممبر کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ ان کی استعداد ہمہ گیر  
 تھی۔ اسی طرح انکا رسالہ بھی صرف ایک صوبے میں  
 محدود نہ رہی۔ چٹنی دور تک اردو کا پیغام جاسکتا ہے  
 وجہ کا گزر بھی وہاں تک ہو جاتا ہے۔ آخری عمر میں  
 وہ ریاست مہاراشٹرا سے وابستہ رہے۔ اور عمر بھر  
 تک وہاں کے بورڈ میں اردو نصاب کے ادبی نگراں بھی  
 رہے۔

۱۹۵۲ء میں انہوں نے اپنا دوسرا مجموعہ کلام  
 "آفتاب تازہ" چٹنا پرنٹنگ کاش لمیٹڈ حیدرآباد سے طبع  
 کروایا۔ اس مجموعہ میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۲ء تک کے کلام  
 کو مرتب کیا جس میں کل ۳ منظومات اور ۳ غزلیات

۱۶ ہیں۔ وحید نے 'ہو ترنگ' کی طرح دوسرے مجموعے کا نام بھی  
اقبال کے ایک شعر سے لیا ہے۔ ۵

آفتاب تازہ پیدا یطن گیتی سے ہوا  
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب ملک

اسی سال انجمن ترقی اردو ہند نے وحید کے کلام کا ایک  
انتخاب شائع کیا جس میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۲ء تک کا  
منتخب کلام شامل ہے جو 'ہو ترنگ' اور 'آفتاب تازہ'  
میں موجود ہے۔

عدالتی شعبہ میں ترقی کرتے کرتے ۱۹۵۲ء میں  
وحید ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے پر  
فائز ہوئے۔ نظام آباد، اورنگ آباد، نانڈیڈ، کنٹر میں اسپیشل  
افسر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی اثنا (۱۹۶۳ء) میں  
اپنا تیسرا مجموعہ 'کلام' اور 'باق مصور' ادبی پرہنگ پر لیس  
بمبئی سے شائع کروایا۔ اس مجموعہ میں کل ۷۵ منظومات  
اور ۷۳ غزلیات شامل کی گئی ہیں۔ ان میں 'ہو ترنگ' کی ۲۲  
منظومات اور ۱۶ غزلیں بھی شامل ہیں۔



”اوراق مصور“ میں وجد کا ایک مفصل اور مستند

دیباچہ بھی شامل ہے۔ جس سے ان کے شعری مسلک

کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس مجموعہ کلام کا

رسم اجرا ہمارے سابق وزیر اعظم انجمنانی شری پندت

جواہر لال نہرو کے ہاتھوں ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا تھا۔

۱۹۷۱ء حیدرآباد کی تاریخ میں جس طرح ایک عظیم

القلاب کا باعث ہوا۔ وجد کی زندگی میں بھی سنگ میل

سے کم نہیں تھا۔ طبیعت کی افتاد کچھ ایسی تھی کہ انہیں

مخصوص غذا پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ چکنی چکنی مرغین چیزوں

سے ممکنہ پرہیز کرتے تھے۔ میوے مٹھائیوں کے شوقین

مولوی عبدالحق کی طرح وجد بھی میوے شوق سے کھاتے

اور کھلاتے تھے۔ اکثر پیمپش کی شکایت ہو جاتی تھی۔

۱۹۷۱ء سے دمہ کا مرض بھی لاحق ہو گیا۔ خود اکثر کہا

کرتے تھے۔ بلگرامیوں سے مجھے دو چیزیں تحقیقاً ملی ہیں۔

ایک پیمپش۔ دوسرا دمہ درحقیقت ان چیزوں کے ماورا

اگر کوئی اور چیز وہاں سے لی ہے تو وہ ہے دوستی۔

۸۸  
انگریزوں سے ان کی دوستی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔  
جو آخر تک برقرار رہی۔

دے کے عارضے کے بعد انکی رہی سہی ایک  
ادھ دسمہ داری بھی خاتون (ان کی بیوی) کے سر پر  
ٹیکر کی رائے کے مطابق انھیں گھر کی چھوٹی بڑی  
ہر طرح کی الجھن سے دور رکھا گیا۔ اسکے باوجود شاعر  
کی حساس طبیعت کب چین لینے دیتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء  
میں خاتون کی خواہش پر انہوں نے پیش از وقت ملازمت  
سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ یوں کہیے۔ اس سلسلے میں

صرف خاتون کی خواہش ہی نہیں بلکہ وسیع کاشتکارانہ  
ذوق بھی کار فرما تھا۔ جو ان کو ملازمت کی پابندیوں  
سے بے نیاز کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے اپنا قیمتی وقت  
شعر و سخن کے گیسو سنوارنے کیلئے وقف کر دیا۔ اسی  
سال ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کر کے کیلئے

انجمن ترقی اردو ہند نے انھیں اپنا لائف ممبر اور مہاراشٹر  
کی شاخ کا صدر منتخب کیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء کو یوم جمہوریت

تقریب میں انھیں صدر جمہوریہ نے پدم شری کے اعزاز  
 میں نواز گیا۔ اور ۱۹۷۳ء میں وہ صوبہ بہار اسٹریٹس  
 راجیہ سبھا کے رکن بھی منتخب ہو گئے۔ اس زمانے  
 میں ان کا قیام ساوتھ ایوانیو نی دہلی کے کواٹر ۵۵  
 میں رہا۔ جو ان دنوں اکثر اردو شعراء و ادباء کا مہمان  
 خانہ بن رہا۔ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی رقم طراز ہیں:  
 ”وہ اپنا زیادہ وقت پارلیمنٹ کی لائبریری  
 میں گزارتے تھے۔ اپنی پسند کی ایسی تمام  
 کتابیں انہوں نے پارلیمنٹ کی لائبریری  
 کیلئے منگوائی تھیں جن میں زر مبادلہ کی  
 رقوم کے باعث دوسری عام لائبریریوں  
 کیلئے بالراست منگوانا ممکن نہیں تھا۔“ لے  
 تقریباً ۱۵ سال تک وہ راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ اور  
 اور اردو کیلئے برابر لڑتے رہے۔ یہ وہی زمانہ ہے  
 جبکہ پروفیسر نور الحسن مرکز میں وزیر تعلیمات تھے۔  
 لے صفی الدین صدیقی۔ وجد شاعر و شخص مکتبہ جامعہ لکھنؤ

پروقیس نور الحسن مرخا مرخج اور شریف النفس تو تھے ہی  
 لیکن خاصے سست طبیعت کے مالک تھے۔ جب بھی  
 اردو کا مسئلہ سامنے آتا یاں مٹوں کہ دیا کرتے۔ جیسا  
 وجد کو بڑا ملال ہوتا۔ آخر انہوں نے ایک وقت پارلیمنٹ  
 میں یہ شعر تک سنا دیا۔

اردو کا حال کیا کہیں اہل وطن سے ہم  
 تنگ آگئے ہیں سستی نور الحسن سے ہم  
 دوستانہ مراسم کو برقرار رکھتے ہوئے غم و غصے کا بروقت  
 اس سے اچھا اظہار شاید ہی کسی اور طریقہ سے ہو سکتا  
 تھا۔ اس شعر میں طنز کا تیر بھی ہے۔ حقیقت کا پیر تو بھی  
 اور رنج کا اظہار بھی۔ وجد کی تنگ مزاجی یہ کب برداشت  
 کر سکتی کہ اردو کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہو اور سابق  
 منصف پارلیمنٹ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔  
 مولانا آزاد تعلیمی سوسائٹی اور نگ آباد کب  
 ایسے گوہر نایاب سے مستفید نہ ہوتی، جبکہ وہ ملازمت  
 سے سبکدوش ہونے کے بعد اور نگ آباد ہی میں سکونت

اختیار کی۔ اس سوسائٹی نے وسجد کو اپنا وائس پریسڈنٹ بنالیا۔ ان فرائض کی انجام دہی کے دوران وسجد نے ۱۹۷۷ء میں اپنا چوتھا شعری مجموعہ "بیاضِ مریم" طبع کرایا۔ اور اسکی انفرادیت کو برقرار رکھنے اور اسکو اسمِ بامسمیٰ بنانے کیلئے مکمل مجموعہ کلام اپنے ہی قلم سے لکھا۔ اسکا انتساب بھی اپنی ایک تہذیب دان و رفیق نواب مہدی یار جنگ کی صاحبزادی اور نقیب بلگرامی کی اہلیہ مریم بلگرامی صاحبہ کے نام کیا۔ جو ان کی شخصیت کے ساتھ ان کی تحریر کی بھی دلدادہ ہیں۔ اس مجموعہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف ایک نظم "حسین کی تصویریں" کے علاوہ ساری تخلیقات اوراقِ مصور آفتاب تازہ اور لہو ترنگ میں شامل نہیں۔ اس میں وسجد کی ہر دید و قدیم غزلوں اور نظموں کا ایک انوکھا امتزاج ہے۔ اس کے پہلے چھتے میں ۶۷ء سے ۷۷ء تک کا کلام موجود ہے۔ جن میں ۱۴ منظومات اور ۱۸ غزلیات ہیں۔ اس مجموعہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مجموعی طور پر یا

بہر علاوہ علاوہ اس مجموعہ میں وسیعہ کی غزلیات کی تعداد  
 منظومات کی یہ نسبت زیادہ ہے اس سے اس بات کا پتہ  
 چلتا ہے کہ وسیعہ جو اپنے دوستوں میں نظم لکھ دوں گا  
 کا فقرہ کہتے تھے۔ غزل گوؤں کی سمت مائل ہوئے۔  
 ان کے ان غزلوں میں بھی ایک طرح کی جدت نظر آتی ہے  
 اس کے علاوہ اس مجموعہ میں دیگر شعرا کے چند اشعار  
 بھی شامل کئے گئے ہیں۔

بیاض مریم کی ایک اور خصوصیت یہ کہ اس میں وسیعہ  
 کے اشعار پر بنائی گئی ہندوستان کے مایہ ناز آرٹسٹ  
 مقبول فدا حسین کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ یہ تصاویر  
 شاعر کے جذبات کو بے محابا واضح کرنے اور پنہاں نکات  
 کو بے لحاظ نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس اچھوتے  
 امتزاج کو جس میں مصوری اور شاعری دونوں پہلو پہلو  
 چلتے ہیں اردو عجوبوں میں پہنت کم دیکھا گیا  
 بیاض مریم پر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے تین ہزار  
 روپے کے انعام سے نوازا اور غالب انسٹیٹیوٹ

نئی دہلی کے ~~مجموعہ~~ میں اس مجموعہ پر پانچ ہزار روپے  
۲۰ ایوارڈ عطا کیا۔

دسمبر ۱۹۷۷ء میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے وائس  
چیرمین مقید ہونے انجمن ترقی اردو نے دسمبر کے انتخاب  
کلام کا پانچواں ایڈیشن شائع کیا۔ جس میں سقندریہ سے  
۱۹۷۷ء تک کا کلام ملتا ہے۔ یہ بڑا ہی مستند انتخاب  
ہے۔ بیاض مریم کی اشاعت کے ساتھ ہی ان کی شاعری  
کا اور زیادہ شمارہ ہونے لگا۔ وہ نقاد جو سکندر علی  
دسمبر سے کم آشنا یا ان کی ادبی حیثیت کے قدرے کم  
متعرف تھے۔ اس مجموعہ کی تعریف کرنے لگے۔ ڈاکٹر  
وحید اختر نے ہفتہ روزہ ہماری زبان یکم نومبر ۱۹۷۷ء  
کے شمارہ میں ایک تبصرہ "بیاض مریم کا شاعر" کے زیر  
عنوان لکھا جو سکندر علی وحید کی پوری شاعری کا احاطہ  
کرتا ہے۔ وحید اختر کے بموجب۔

۔ اور ابقی مصور اور بیاض مریم کے  
بالا دستیچاپ مطالعے نے مجھے اتنی

ڈاکٹر مغن تبسم نے بھی ایک جامع تبصرہ "مبصر"  
 حیدرآباد میں شائع کیا۔ اسی طرح سردار جعفری کا  
 تبصرہ بلٹنر میں شائع ہوا ڈاکٹر سیدہ جعفر، اشفاق حسین  
 مرحوم، مسعود حسین خاں اور شاذ شکنت نے بھی  
 بیاضا مریم پر تبصرے لکھے۔

۱۹۷۷ء میں جب وجہ کے کلام کا انتخاب شائع  
 ہوا تو ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس انتخاب پر ایک خاصا  
 طویل تبصرہ ہفتہ روزہ بلٹنر ۱۳ ستمبر ۱۹۷۷ء میں تحریر  
 کیا۔ اس تبصرہ میں تنک مزاج اور نازک وضع قطع والے  
 وجہ کے آہنگینہ دل کو ٹھیس پہنچانے والی بعض باتیں  
 بھی تھیں۔ ظ صاحب نے اوراق مصور کی اشاعت کے  
 بعد "وجہ کا شعر" کے زیر عنوان ایک مضمون ماہنامہ  
 "صبا" حیدرآباد دسمبر ۱۹۶۳ء میں لکھا تھا۔ انداز تو وہی  
 ہے وجہ اختر "وجہ صاحب کچھ یادیں کچھ باتیں" وجہ شاعر و  
 شخص "مکتبہ جامعہ لشبہ ۱۹۸۵ء



تھا جو کہ بلٹز کے مضمون کا تھا۔ لیکن یہ تحریریں بہر حال ایک دو جگہوں پر مختلف ضرور ہیں۔ وسجد نے طا صاحب کی رائے کو جو کچھ پاتے نہیں وہ عجیب اکثر ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کے مصداق سمجھا اس کا راست جواب دینا وسجد جیسی باوقار بزرگ شخصیت کے بس کی بات نہیں تھی لیکن وہ تبصرہ نگار کا جواب دینا بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک نظم جو دراصل تحسین ناسٹناس کے زیر عنوان ۱۹۵۷ء میں کہی گئی تھی۔ اور جس کو ترمیم و اضافہ کے ساتھ اوراق مصور میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ مزید چند اشعار کا اضافہ کرنے کے بعد ہفتہ روزہ بلٹز ہی میں شائع کر دیا اور لکھا گیا کہ یہ نظم تبصرہ نگار کے ہر سوال کا جواب ہے۔ یہی ہجو یہ نظم روز نامہ سیاست حیدر آباد بہر مئی ۱۹۸۲ء میں بھی شائع ہوئی۔

سکندر علی وسجد نے علمی و ادبی دنیا میں اپنی صلاحیتوں

سے ممکنہ کام لیا۔ جنوری ۱۹۸۷ء میں انجمن ترقی اردو

اورنگ آباد کی شاخ دوبارہ تشکیل پائی اور ایک نئی  
ایڈہاک کمیٹی اور مجلس مشاورت کی تنظیم عمل میں آئی  
تو وجہ کو اسکا صدر منتخب کیا گیا۔ جن کی نگرہداری میں  
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اپنی کارکردگی میں مصروف تھی  
سکندر علی وجہ بحیثیت صدر پہلی خواہش یہ ظاہر کی تھی  
کہ مقامی مدارس اور کالجوں میں امتیازی نشانات حاصل  
کرنے والے طلباء و طالبات کو بابائے اردو مولوی عبدالحق  
انصاری سے نوازا جائے۔ اس فرمائش کا احترام کرتے  
ہوئے انجمن نے اس کی تعمیل میں مسرت محسوس کی تھی  
اسکے علاوہ وجہ نے اردو کی ترقی اور فلاح و بہبودی  
کیلئے انجمن کو اپنے گراں بہا مشوروں سے مستفیض  
ہونے کا حریص موقع فراہم کیا تھا۔

حکومت مہاراشٹر نے مارچ ۱۹۸۱ء میں ایک  
قرارداد کے ذریعہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی  
کو تحلیل کر کے نئے بورڈ آف گورنرس کی تشکیل کی  
اس کے نو منتخب نمائندوں میں سکندر علی وجہ بھی

نمبر ۱۹۵۸ء میں ترقی اردو بورڈ کا دوسالہ چھٹا  
انتخاب ہوا۔ تو وجہ کو اس بورڈ کا وائس چیرمین  
نامزد کیا گیا۔ ان سے پیشتر آل احمد سرور اس عہدے  
پر فائز تھے۔

ترقی اردو بورڈ کی گیارھویں میٹنگ ۱۹ دسمبر  
۱۹۸۷ء کو شاشتری بھون میں منعقد ہوئی۔ اس  
میٹنگ میں وجہ نے خرابی طبیعت کی وجہ سے شرکت  
نہیں کی البتہ جون ۱۹۸۷ء میں منعقدہ میٹنگ میں وہ  
شریک رہے۔ یہی پہلی اور آخری میٹنگ تھی۔ جہیں  
وجہ نے شرکت کی۔

وجہ کی ادبی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے  
مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کی جانب سے دو روزہ  
جشن وجہ لا اور ۲۱ دسمبر ۱۹۸۷ء کو منعقد ہوا۔  
اس جشن کی افتتاحی تقریب مولانا آزاد کالج کے اوپن  
ایئر تھیٹر میں ۱۱ دسمبر کو شام کے پانچ بجے منعقد  
ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر ذکر یا (سابق ایم۔ پی۔ اے)

انجام دی۔ اور مرٹھواڑہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر  
 مسٹر گویند راؤ مہیشکر نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے  
 شرکت کی اور انھیں کے ہاتھوں جشن وحدہ کے سلسلے  
 میں شائع کردہ سمونیر کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ مولانا  
 آزاد کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مظہر محی الدین کے استقبالیہ  
 تقریر کے بعد خواجہ عبدالغفور اہنت بھالے راؤ، قاضی سلیم  
 اور ڈاکٹر اے اے مٹھی نے اپنی تقاریر کے ذریعہ وحدہ کی  
 شخصیت اور ان کے فن کو خراج عقیدت پیش کیا  
 مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کی جانب سے وحدہ کی

خدمت میں -/- ۱۰۰۰۰ دس ہزار روپے کا کیسہ زر  
 پیش کیا گیا۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے بھی پانچ  
 ہزار کا چیک پیش کیا۔ بی۔ آر۔ مہیشکر وائس چانسلر  
 نے اپنا تقریر کے بعد یونیورسٹی کی جانب سے بھی  
 ۱۰۰۰۰ پانچ ہزار کا کیسہ زر کا اعلان کیا۔ وحدہ کی حضور

طہارت اور فارغ البالی طبیعت نے انھیں مولانا  
 آزاد کالج کی جانب سے پیش کردہ ۱۰۰۰۰ دس ہزار

روپیے کا کیسہ ترر طلبہ ہی کی امداد کے لئے دے دیا۔  
مرٹھواڑہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جی۔ آر۔ مہیشکر نے  
وسجدہ کو ڈی لٹ کی سند کے لئے وسجدہ کا Biodata  
حاصل کیا۔ ڈاکٹر مجید بیدار کے بموجب یہ سند آئندہ  
کا نوکیشن کے موقع پر دن جانے والی تھی۔

جشن وسجدہ کی اس تقریب کے ساتھ ہی وسجدہ کی  
منظومات اجٹا ایلورا کو پردہ فلم پر پیش کیا گیا۔  
اور ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ دوسرے دن وسجدہ کی  
۵ سالہ ادبی خدمات کو پیش نظر رکھ کر وسجدہ کی شخصیت  
اور خدمات موضوع پر ہندو جانتکا لوجیکل اسٹیوٹ  
کی عمارت میں صبح ۱۰ بجے سے سینار شروع ہوا  
جسکی صدارت کے فرائض قاضی سلیم نے انجام دیے  
خواجہ عبدالغفور کی تقریر کے بعد سینار کا آغاز  
ہوا۔ جس میں ڈاکٹر سیدہ جعفر، جیلانی بانو، ڈاکٹر انور  
معظم اور ڈاکٹر عصمت جاوید نے اپنے مقالے پیش  
کئے۔ ان کے علاوہ یوسف ناظم نے ایک مزاحیہ مضمون

کے دورِ یحیٰ وہید کی شخصیت کی نقاب کشائی کی ۔  
وہ فضا! فضا! اورنگ آباد ہو اورنگ دکن

ہے۔ جہاں وہید نے اپنی جوانی کے نغمے الایہ بچھے۔  
انہیں بڑی دلاویز تھیں۔ اس شہر کی فرقت وہید کو  
کبھی مگھوڑا نہیں تھی۔ جب وہ حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم  
حاصل کرنے کی غرض سے آئے تو انکو اورنگ آباد  
کی جدائی کا غم بہر حال رہا۔ انہیں دنوں میں غریب الوطنی  
عنوان کے تحت انہوں نے ایک نظم لکھی۔ جس میں  
فرقت کے درد کو کئی بندوں میں پیش کیا گیا ہے۔

تہائی مصیبت یہ مصیبت ہے مسفرین  
ہو کہ اٹھتی ہے دلیں تو کبھی درد بگڑیں

رہتا ہے جہاں تیرہ دن ایک نظر میں  
ہر مانس پہ شعلے سے سحرک اٹھتے ہیں سر میں

دم بھر کیلئے یاس کی گروں میں جھک سکتی  
سو نے میں بھی شکوں کا روٹھا نہیں نہ رکتی

کہاوت ہے کہ اورنگ آباد کو دو پہیے ہوئے

عاشق نصیب ہوئے ایک اور تگزیب عالمگیر اور  
 دوسرے مولوی عبدالحق جنہوں نے اپنے مقام کو  
 ترک کرتے ہوئے اس جائے پر سکون کو اپنا قیام  
 گاہ بنایا۔ اس لحاظ سے سکندر علی وحید بھی اور تگ آباد  
 کے شیدار ہے۔ اپنا پیدائشی مقام ویجا پور ترک کر کے  
 اس مقام کو انہوں نے اپنا پایا اور دل سے بے پناہ ناخ  
 وید کو شال کرتے ہوئے ہم اس کراہوت کو ایسا بنا لیں  
 تو بے جا نہ ہو گا کہ اور تگ آباد کو تین پہنچے ہوئے  
 عاشق نصیب ہوئے جنہوں نے اپنی عمر کا ایک دور  
 اس کی ناز برداری میں صرف کیا۔ مگر تو اس کی گیسو  
 سنوارتے رہے۔ اور اس کے رامن سفال میں محو  
 خواب ہیں۔

اور تگ آباد چونکہ فنون لطیفہ کا سرگز ہے۔ اس  
 ماحول میں پرورش پا کر وحید کی شخصیت فنون لطیفہ  
 کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں ڈھل گئی تھی۔ ان کے  
 اشعار میں ان کیفیات کو بجا محسوس کیا جاسکتا ہے

بسیار پیشی اب مجسم سوز ہونے دے مجھے  
 شہر جا لے وقت لطف انداز ہونے دے مجھے  
 محبت کے فرشتے گویا آواز ہوتے ہیں  
 اس ارض پاک پر حسن اور نعمہ مل کے بنتے ہیں  
 تخیل پر میرے نقش ہے تیری بہار اب تک  
 مے آنسو تیری الفت کے ہیں؟ یا ملتے دار اب تک  
 وجہ سے ملاقات اور تبادلہ خیال کے لئے راقم الحروف  
 نے نئی یون، سلاویہ اور نگ آباد جاتے کا پروگرام  
 بنایا تھا۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ حیدر آباد پہنچنے پر اطلاع  
 ملی کہ وہجہ ترقی اردو بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کی غرض  
 سے دہلی جا رہے ہیں اور واپس میں ان کا سیمینار ہی میں  
 کچھ دن قیام رہے گا۔ بادل ناخواستہ اور نگ آباد کا  
 سفر ملتوی کرنا پڑا۔ سوچا کہ جشن و سجد کے موقع  
 پر ہی کیوں نہ چلی جاؤں۔ لیکن یہ بھی شاید خدا کو  
 منظور نہیں تھا۔ جشن و سجد ٹھیک اس وقت منعقد  
 ہوا۔ جبکہ ام۔ فل کے تحریری امتحانات کوئی دو تین دن



باقی تھے۔ یعنی ۱۲ اور ۱۲ دسمبر کو اور امتحان ۱۲

اور ۱۲ دسمبر کو ہوئے والا تھا۔ اسی سے بھی عجیب

بات تو یہ رہی کہ یہاں کے اخباروں نے جشنِ وحدہ کی

قبل از جشن کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔ لہذا دو حسین

اتفاقات سے مجھے ہاتھ دھونا پڑا۔ جب آٹھ اپریل کے

ہفتہ روزہ ہماری زبان پرچہ میں وحدہ کی علالت کی خبر

شائع ہوئی تو وحدہ سے ملنے کی دیرینہ خواہش نے پھر

سے ایک بار انگڑائی لی۔ اور ۱۹۸۳ء میں اگر ان سے ملنے

کا موقع بھی ملا تو ایسے وقت جبکہ وحدہ خود فریش

ہو چکے تھے۔ بات چیت کے تو کئی دن پہلے ہی سے

قابل نہیں تھے۔ جب ہم ۲۱ اپریل کو ۲۲ ڈھائی بجے

کے قریب ان کے مکان پہنچے تو وہاں ان کے نستی برادر

محمد شفیع اور کئی دوسرے اقارب موجود تھے۔ پتہ چلا کہ

بیگم زبیدہ خاتون (زوجہ وحدہ) ہاسپٹل ہی میں رہتی ہیں

تھوڑی دیر بعد وحدہ کے اعزاء کے ساتھ ہم نے گھاٹی

سیڈیکل ہاسپٹل کا رخ کیا۔ وحدہ ہاسپٹل میں مزدانہ وارڈ

بھلے میں زیر علاج تھے۔ وہاں کے ڈاکٹر

یس۔ تواز طالب صاحب کا خیال تھا کہ دماغ کی رگیں سکیر

کی وجہ سے خون دماغ تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ

تھی کہ وہ بات چیت کے قابل نہیں تھے۔ ہاسپٹل میں

زبیدہ خاتون صاحبہ کے علاوہ وسجد کی بہن اور سیرادرزادہ

اشرف علی صاحب بھی موجود تھے۔ حسن شاگر صاحب

(وسجد کے متنبی) جو محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے ہیں

ان سے بھی وہیں ملاقات ہوئی۔ وقت وہی کوئی ۲/۲

کے قریب تھا۔ وسجد کو بخار آگیا تھا۔ اور تھوڑی ہی

دیر میں پسینہ پانی کی طرح بہنے لگا۔ پتلا بالکل ٹھٹھا

محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر پل پل کی خبر لینے آتے

انجکشنوں کا سلسلہ جاری تھا۔ پلنگ کی ایک طرف

سلیپ اسٹانڈ پر گلو کوڑکی بوتل لٹکی ہوئی تھی۔ جس

کے پائپ کا تار ان کے بازو میں لگا ہوا تھا۔ اور دوسری

جانب اسٹانڈ پر رقیق غذا کی بوتل لگی تھی۔ جسکے پائپ

بند تھے تاکہ معدہ تک پہنچا یا گیا تھا۔ مختلف ادویات

استعمال سے کیمیاؤں عمل، رد عمل کے نتیجے میں ان کے ذہن پر زخم سے آگئے تھے۔ اور پاؤں سوچ گئے تھے۔

ایسا لگتا تھا جیسے انھیں جسم پر کوئی اختیار ہی نہیں تھا۔ سینر انھیں قریب قریب پتھرائی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ حیات و ممات کے مابین ایک عجیب و غریب کشمکش جاری تھی۔ اسکے باوجود وہ جد کی شخصیت کا

پر تو یہاں بھی بھلکنے لگتا ہے۔ جب کوئی ناگوار بو پھیل جاتی تو چہرے سے ناگواری کا اظہار کر دیتے۔ یا پھر ایک آدھ جملہ بے شکل ادا ہو جاتا تو دانکے ایک

قریب ترین خادم عزیز میاں کی سمجھ میں آتا اور وہ فوراً اسکے مدارک میں لگ جاتے چار دن قریب سے

دیکھنے کے باوجود مجھے اطمینان تو خیر نہیں ہوا۔ البتہ ان کی بعض ایسی باتوں کا کما حقہ علم ہوا جو دسترس سے باہر تھیں۔ بیگم وحید نے اپنی مصروفیات اور ذہنی دباؤ

کے باوجود پورا پورا تعاون کیا۔ ۲۲ اپریل کی رات کو

جب ہم نے واپسی کا ارادہ کیا اور اسٹیشن پہنچے تو ذہن میں

ایک سوال گونجنے لگا۔ آیا اورنگ آباد کا سفر کامیاب رہا؟ مجھے اس کا جواب آج تک نفی میں ہی ملتا رہا۔

کامیاب اسی وقت کہلاتا ہے جبکہ وحید سے ادبی موضوعات پر بحث ہوتی ان سے باضابطہ ملاقات ہوتی اصناف سخن پر ان کے خیالات سے مستفیض ہوتی۔

واپسی کے بعد میں پوری طرح متوجہ بھی نہیں ہو پائی تھی اور شخصیت کا باب ابھی مکمل بھی ہونے نہ پایا تھا کہ ارتحال و جد کی اندوہناک نیرملی چارو ناچار بادل ناخواستہ ان الفاظ کو ترتیب دینا پڑا۔ کہ وحید نے گیارہ ماہ کی طویل علالت کے بعد اورنگ آباد کے میڈیکل ہسپتال میں روشنی ۱۶ مئی ۱۹۷۹ء کی صبح کو بعارضۃ قلب اس دنیا سے رنگے ہوئے کوچ کیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اور اسی شام ۱۷ مئی ٹاؤن ہال کے قریب واقع حضرت حضورؐ کی درگاہ کے احاطے میں وحید کا جسد سپرد خاک کیا گیا۔

# وحید کی نظم نگاری

علی گڑھ تحریک، آزاد حالی اور شعلی وغیرہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بیسویں صدی کے آغاز سے اردو نظم نگاری کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ آزادی کی جدوجہد نے بھی نظم نگاری کو وسعت دینے میں اہم حصہ ادا کیا۔ مغربی شعر و ادب سے واقفیت نے گویا سونے پر سہاگہ سناٹا م کیا۔ اسی صدی سے ہیں جو شعری و ادبی ورثہ ملا وہ نئی نئی راہوں پر گامزن ہونے کیلئے آزاد راہ بن گیا۔ جس سے استفادہ کر کے اردو شاعری نے اپنا ایک آگاہ اور منفرد مقام حاصل کیا۔ روایت سے بغاوت کے چراغ جلائے گئے۔ جس کی ملی جلی روشنی اردو کے شعراء کو ذی شعور بنانے میں مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ جب کہ وحید نے شعر گوئی کا آغاز کیا

اردو شاعری کے افق پر اکبر الہ آبادی، اقبال، نظم طباطبائی،  
 محسن کاکوری، سیلاب اکبر آبادی، جوش ملیح آبادی، اختر  
 شیرانی اور حفیظ جالندھری جیسے شاعر نظم نگاری کے افق پر  
 چھائے ہوئے تھے تو غزل نگاروں میں حسرت، مرقا،  
 جگر، فانی اور اصغر امیازی مقام کے حامل تھے۔ ترقی پسند  
 تحریک کو شروع ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں رہ گیا تھا۔  
 بلکہ وہ شاعر ہو آگے چل کر ترقی پسند شاعری حیثیت سے  
 معروف ہوئے۔ اس وقت اپنی شاعری کی کمی خیز لیں طے  
 کر چکے تھے۔ جنہوں نے حالی اور ان کے رفقاء کے بعد  
 نظم نگاری کی تو سیح میں معتدیہ کردار ادا کیا تھا فضل احمد  
 فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، جانثار اختر  
 علی سردار جعفری، مختار موحی الدین اور قتیل شفائی  
 سپر شعراء ادب پر نمودار ہو چکے تھے۔ ترقی پسندوں کے  
 حوالے سے احتراز نے بھی بیشتر شعراء کو نظم نگاری کی  
 طرف متوجہ کیا۔ جسکی وجہ سے ادب اور زندگی، ادب  
 اور سماج، ادب اور سیاست، ادب اور انسانیت کے

رشتے مضبوط ہونے لگے۔ لہذا ادب اور سیاست کا جو  
 درالا اور خوشنما امتزاج و جوہر میں آیا وہ عمری پسند  
 کا مفرد وصف ہونے کے علاوہ کفاحیہ وقت بھی تھا۔  
 اب شاعری کی زندگی سے دراجنگی نے اسکو ہمہ جہتی  
 عمری کی راہ پر گامزن کیا۔ بقول شخصہ شاعری اور زندگی  
 اب ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ شاعری اب نہ صرف غلامی  
 و آزادی کی حکایت تھی بلکہ حکومت برطانیہ کے ظلم و  
 تشدد، ہمدردی و استبداد کے خلاف سرمایہ داری کی عفریت  
 اور انگریزی حکومت کی پھیلائی گئی عقوبت کے انسلاد  
 کے لیے بھی سینہ سپر ہو گیا۔ اس طرح شاعری کی زندگی  
 کے قصیری کاموں میں افادیت کو تسلیم کر لیا گیا۔  
 ظلم، ہمدردی، رخصت و ملت میں تحلیلات و حلیات  
 عرض اب شاعری افغانی کو حیات کا حصہ بن گئی۔  
 اقبال نے وقت اور ضرورت کو پیش نظر رکھ کر  
 ملی و قومی منظومات کا آغاز کیا۔ یوں بھی حالتی کی آمد  
 جبر اسلام، اس ضمن میں بطور نمونہ موجود تھی۔ لیکن

اس میں جو خطیبانہ انداز و آہنگ ہے وہ گوش کو  
 کبھی کبھی گوارا نہیں گذرتا۔ حاتی نے اپنی تخلیق میں جیسا کہ  
 نام سے ظاہر ہے قوم کی پست و بلند کی کو رونا کیا تھا۔  
 گویا انہوں نے قوم کو اسکے مزاج سے آگاہ کیا۔ بالفاظ  
 دیگر حاتی نے قوم کے مرض کی صرف تشخیص کی جبکہ اقبال  
 نے اس مرض کیلئے نسخہ بھی تجویز کیا۔ نظم نگاری جو صرف  
 نعرہ بازی کے حصاروں میں مقید ہو چکی تھی۔ اب تغزل  
 کے روشن افق پر آگئی۔ انہوں نے نئے نئے علامتوں کا انتخاب  
 کیا۔ الفاظ کے معنوی پسیر بدل ڈالے اور انکو نئے ظروف  
 میں ڈھالا۔ مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید سے  
 اردو نظم نگاری میں جو کوتاہیاں در آئی تھیں انہوں نے انکے  
 سدا رک کی بھی سعی کی۔ اکبر الہ آبادی نے بھی مغربی معاشرے  
 کی پھیلائی گئی عفویت کے خلاف نعرہ احتجاج بلند کیا  
 تھا۔ جوش ملیح آبادی نے نظم نگاری کو شبابیات کے علاوہ  
 انقلاب آوار رجحانات سے بھی روشناس کر وایا۔ اور  
 ملک کی آزادی کے نعے گائے۔ اس طرح آزادی کا



نواب دیکھنے والوں میں چمکتی بھی شامل تھے۔ جنہوں نے  
 ہندوستانیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ان کی  
 شرجانی و نمائندگی کی۔ اختر شیرانی نے اردو نظم نگاری  
 کو ایک نئے موڑ پر لے آیا۔ انہوں نے اردو میں سائنٹ  
 نگاری کو فروغ دینے میں کما حقہ حصہ ادا کیا اور اسکے علاوہ  
 رومانیت کو بھی اردو شاعری سے ہم آہنگ کیا۔ رومانی  
 منظومات کو اختیار کرنے والوں میں اسرار الحق، عجاز، حفیظ  
 جالندھری، اور اختر انصاری بھی شامل ہیں۔ ان کے  
 ہاں دوسرے لوازمات کے ساتھ ساتھ رومانی تصورات  
 کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ اس عہد کے بیشتر شعراء مقصدی  
 منظومات کہتے رہے۔ ان کا مطلق نظر سماجی اصلاح تھا۔  
 ان کا انداز بیان بھی اسی لحاظ سے سیدھا سادہ و عمومی  
 ازدل یزد، بردل خیزد، کے مصداق معلوم ہوتا تھا۔  
 ہوتے ہوئے بعض شعراء میں ایک طرح کی سطحیت سی  
 آگئی۔ اسی پس منظر میں کئی شعراء کی تربیت ہوئی جو  
 آگے چل کر ان کی گروہوں میں بٹ گئے۔

۱۔ شاعر کی تخلیق شخصیت اپنے گرد و پیش  
 کی بہک ضرور رکھتی ہے۔ خواہ فن میں اس  
 کا اظہار منفی انداز میں ہو یا مثبت طور پر۔  
 سکندر علی وقید کی شاعری کی ابتدا بھی جو نکلی ہو لیکن  
 میں جوتی تھی۔ انہوں نے غزل کو اپنا لے جو ستم ظلم کی طرف بھی  
 توجہ دی۔ ان کی ابتدائی شاعری میں متذکرہ بالا شاعر کی آواز  
 ملتی ہے۔ میر انیس کے مرثیوں سے ان کا ضعف اسی طرز کے  
 مسدس لکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کی شاعری میں سماجی کا غطیانہ  
 انداز، افسانہ کا سوز و گداز، جوئی کا فخر و انقلاب، اختصار  
 شیرازی اور حسیہ کی روحانیت غرض ہر چیز بڑے ہی  
 قرینے سے بھی دیکھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی ابتدائی  
 منظومات اور ننگ آباد کے انٹرمیڈیٹ کالج کے میگزین  
 "نور" میں انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ "اردو"  
 کے شماروں میں شائع ہوتی رہیں۔ اس طرح انھیں ابتدا  
 ہی سے ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ غزل سے اپنی  
 شہرت اور سید جعفر و وقید کی نظم "وقید شاعر اور شخص" مکتبہ جامعہ لیبڈی نئی دہلی سے

شاعری کی ابتدا کرنے والے اس شاعر کو اکثر نظم ہی لکھنے کا خیال آتا تھا۔ یہ ان کی طالب علمی کے دور کی بات ہے۔ کہ اکثر جب کسی پر کچھ خفا ہوتے تو کہہ دیتے "بیٹا نظم لکھ دوں گا۔" ان کا یہ خیال تا دمِ زیست باقی رہا۔ جب انہوں نے شاعری ترک کر دی تو سوچا کہ اس عنوان پر ایک مضمون لکھا جائے لیکن ساتھ ہی انکی طبیعت کی افتاد نے انہیں نظم کی طرف متوجہ کیا۔ ایک مکتوب مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء بنام جناب عابد علی خاں مدیر روزنامہ سیاست میں لکھتے ہیں:

"میں "ترکِ مشاعرہ" پر ایک مضمون بھیجنا چاہتا تھا۔ پھر خیال آیا اس عنوان پر ایک نظم ہونی چاہیے۔"

اس کے علاوہ ایک مکتوب بنام مریم بلگرامی مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۸۲ء میں یوں رقم طراز ہیں:

میں نے دو سال سے شاعری ترک کر دی

ہے۔ جو دیکھا تو یہ بھی دیوانہ بن گیا۔"

نظم سے انکی خصوصی دلچسپی انہیں آگے چل کر اجتناب الی

تاج محل، کارواں زندگی، مزدوروں کا پیغام، جیسے کئی  
 مایہ ناز شاہکاروں کی تخلیق کا باعث ہوئے۔ اور رنگ آباد  
 کاروچ پرور ماحول، وہاں کے تاریخی مقامات، خوش منظر  
 قلعے، یادگار کھنڈرجن سے ماضی کی کئی خوشگوار یادیں  
 وابستہ ہیں۔ یہ سب چیزیں ان کی نظم نگاری کی محرک ہوئیں  
 صدیوں کی تہذیبی وارداتیں، تاریخی عمارتیں نامور شخصیتیں  
 ان کے موضوعات بنے اور ان کی شاعری کو مزین و مبسوط  
 بناتے ہیں نمایاں حصہ ادا کیا۔

وجہ ابتدا ہی سے بندھے ملکے قوانین کے پابند اسلا  
 کے پیر و کلا سکیٹ کے علمبردار اور روایت کے طرفدار رہے  
 ہیں۔ لہذا ان کی منظومات میں نہ کوئی ایسی نمایاں تبدیلی رونما  
 ہوئی اور نہ کوئی ہیئتیں تجربہ ہی وہ کر سکے۔ ان کی منظومات  
 کی ابتدا ترقی پسندوں کے نظم پر ور عہد میں ہونے کے  
 باوجود اوصاف ترقی پسندی سے بری معلوم ہوتی تھیں  
 و جدت نے اپنی شاعری کو زندگی کے علاوہ انسان کی عظمت  
 و رفعت اسکی ہمہ جہتی ترقی و ترویج، ہندوستان کی تاریخی

و سیاسی حالات اور یہاں کے قانون لطیفہ سے وابستہ

کر دیا۔ اوراق مصور کے دیا چہ میں اسی کی وضاحت

کی ہے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ان کی شاعری

طاقت اور حسن حاصل کرتی رہی۔ اس کے علاوہ ان کی

منظومات میں عصری آگہی اور عصری حسیت کا شعور بھی

ملتا ہے۔ جو ادبی محاسن، زندگی کے مسائل اور شعری

لطفوں کے امتزاج سے ایک مفید معجون کی صورت اختیار

کر گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا قانون لطیفہ سے شغف

شاعری کیلئے سونے پر سہاگہ سے کم نہیں۔ و سجد کی

منظومات زندگی کے حقائق کی صحت پر عکاسی کرتی ہیں

موضوعات کے اعتبار سے ان کی منظومات کو مختلف

زمروں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ جن میں تاریخی، شخصی،

قومی، تمدنی و ثقافتی منظومات اہم ہیں۔ و سجد کی بیشتر

منظومات یا تو مسدس کی شکل میں ہیں یا پھر مخمس کی

صورت میں۔ انہوں نے کبھی ترجیع بند لکھے ہیں۔ اور کبھی

ترکیب بند۔ بعض منظومات جیسے گہوارہ مسیح "فیہی ناگن

اور رقاہہ مشتقی ہیں۔ جن کے ہر بند میں اشعار کی تعداد  
 مختلف ہے۔ آہستہ گزر اور کی ہم کے ہر بند میں چار  
 نظمیں ہیں۔ بیض منظومات مثنوی کی ہیئت میں لکھی  
 گئی ہیں۔ بو طویل بھی ہیں اور مختصر بھی اور اکثر غزل  
 کے فارم میں لکھی گئی ہیں۔ اور تغزل کی پوری نمائندگی  
 کرتی ہیں۔ ان منظومات کا ظاہری و معنوی حسن دونوں  
 غزل سے میل کھاتے ہیں۔ ایسی منظومات میں خیال کا  
 تسلسل بھی ہے اور غزل کی سی کیفیت بھی، ڈاکٹر  
 حامی کاشمیری لکھتے ہیں۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجد نظم کے محنت سببی  
 حسن کی تشکیل کی طرف بھرپور توجہ نہیں کرتے۔  
 وہ کسی مربوط تحریر بے کو پیش نہیں کرتے انکی  
 نظمیں عموماً نثر کا انداز رکھتی ہیں۔ ان میں  
 ہر شعر ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔"

۱۔ ڈاکٹر حامی کاشمیری، حیدر آباد و نظم اور ادبی اشعار

مجلس اشاعت ادب دہلی، ۱۹۶۸ء۔

گو! وحید نے نظم میں غزل کا رنگ و آہنگ شامل کر کے معنوی اور صوری دونوں پہلوؤں سے اس کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ خصوصاً ایسی منظومات میں جن میں ردیف و قافیہ کی پابندی ملتی ہے۔ غزل کا رنگ یا آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اور ان کا ہر شعر غزل کے شعر کی طرح جداگانہ اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے۔ اور اس کے علاوہ شعریت و تغزل جو غزل کی جان ہے ان کی منظومات میں بالعموم جاری و ساری ہے، ایک کیف و سرشاری کی صورت میں۔

وحید نے بیشتر منظومات ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیات پر لکھی ہیں۔ جو تاریخی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ گو یا وحید کی شاعری ہندوستان کے مدبر حکمرانوں، جانناز و جیالے سپاہیوں پر نظم و بندہمت، مجاہدین قوم، شہیدان وطن، سیاسی لیڈروں سے مانوس ہے۔ انہوں نے بعنوان "عبدالرزاق لاری" سلطنت قطب شاہی کے جانناز سپاہی پر چھ بندوں پر

مشتمل ایک مسدس لکھی ہے۔ جس میں اس کی بہادری  
 و وطن پرستی کو ملحوظ رکھا گیا اور اسکی وفا شعار  
 کا ثبوت ہم پہنچا یا ہے کہ عبدالرزاق لاری بہت زخم  
 کھاتے کے بعد بھی بڑی جوانمردی سے لڑتا رہا یہاں تک  
 کہ بے ہوش ہو گیا۔ اس نظم کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ  
 عبدالرزاق لاری کے کردار کو وجد نے زیادہ پر شکوہ  
 اور زیادہ متاثر کرنے والے کردار کے روپ میں پیش  
 کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے  
 کہ افسانوی تخیل و شعری مبالغہ کا دخل نہ ہو۔ اس  
 نظم کا ہر بند بلکہ ہر مصرع تاریخی صداقت کا حامل  
 اور مظہر ہے۔ اس نظم کا فارم اور ایجہ دونوں میرا نہیں کے  
 عراقی سے ملتے ہیں۔ یہ نظم وجد کی ابتدائی منظومات میں  
 بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن معنویت اور تاریخت  
 سے بھر پور ہے۔ اس نظم میں زرمیہ تشبیہات Epic Similes  
 بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہوں۔



شمشیرِ دکن تو نے عجب دھاک بٹھادی  
 دشمن کو شبِ گور کی تصویر دکھادی

اے مردِ خدا قدر و قوت تو نے بٹھادی  
 قربان ترے مالک کیلئے جان لڑادی

جب تک یہ نظامِ سحر و شام رہے گا  
 تاریخِ دلیراں میں ترا نام رہے گا  
 فیصل جعفری و سجد کی اس نظم کے بارے میں بجا طور پر لکھا  
 ہے کہ دراصل یہ :

” صرف لاری کی ہی نہیں بلکہ جذبہٴ وفاداری  
 اور اظہارِ شجاعت جیسی اقدار کی تعریف ہے اے  
 اس کے علاوہ ’چاند سلطنت‘ بھی اسی قبیل کی حرکت  
 اگر نظم ہے جس میں سلطنتِ نظامِ شاہی کی آخری ملکہ  
 چاند سلطنت کی پاندِ ہمتی اور بہادری کو بڑی خوبی سے  
 نظم کیا گیا ہے۔ خطِ انصاری نے لکھا ہے :

” فیصل جعفری ’سلندر علی و سجد کی تین نظمیں‘ ” و سجاد شاعر اور  
 شخص ” مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ فکر نئی دہلی ۱۹۸۵ء

”وہجد کی شاعری سے دکن کی اس عظیم تاریخی  
عمارتوں اور شخصیتوں کا قصور و البسط ہو گیا ہے۔

کون وہجد؟ وہی اجتا، ایلورا والے وہجد

حیدر آبادی“ لے

اس سلسلے میں وہجد کی جو اور منظومات مشہور ہیں۔

ان میں چکبست، محمد علی، مہانتا، مہاراجہ کشن پرشاد، اقبال  
نظیر اکبر آبادی، ولی اور نگ آبادی، جو آہر لال نہرو، اندرا گاندھی  
پیروین سلطانی، لغھے کی موت، مارلن منرو، حضرت زرنخش  
طیبہ، رقاصہ، حسین کا آرٹ، والد مرحوم، شیخ چاند، اور اشفاق

کے نام پیش پیش ہیں۔ وہجد نے ان ساری منظومات میں  
متعلقہ افراد کے شخصی اوصاف کو نمایاں کرتے ہوئے ان کی  
قوم، ملی اور فنی خدمات پر بھی ہنرمندی کے ساتھ روشنی  
ڈالی ہے۔ اور ایسا سمجھ لور خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ  
ادب میں ہمیشہ یادگار رکھا جائے گا۔

اقبال، نظیر اکبر آبادی، ولی اور نگ آبادی، منظومات میں

”نصاری، وہجد کا شعر“ نیا“ ماہنامہ حیدر آباد دسمبر ۱۹۶۳ء

۲۱  
 وہ ان اشخاص کی شاعرانہ صلاحیت سے متاثر نظر آتے ہیں  
 جبکہ چکیست کو ان کی شعری خدمات کے علاوہ مجاہد آزادی  
 کی حیثیت سے بھی یاد کیا ہے۔ جب کہ نظم 'محمد علی' میں  
 محمد علی ایک سچے مجاہد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں نظم  
 'محمد علی کا ایک بند ملا جملہ ہو'۔

نفرت ازلی تھی تجھے دینار و درم سے  
 جھپکی نہ کبھی آنکھ تری جاہ چشم سے  
 سر جھکتے سکا سطوت اسکندر وحیم سے  
 بجای تھی زبان آنگ بستی تھی قلم سے

تحریر سے شہزادنگ عیاں قلب تپاں کا  
 تقریر میں تھا سوزِ محباہد کی اداں کا  
 وہجد کی نظم 'مہاراجہ کرشن پرشلا' نہ صرف مہاراجہ  
 موصوف کی توصیف میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ ایک علامت  
 ہے جو اس دور کے حیدرآبادی تہذیب کی شناخت کرتا  
 ہے۔ جس میں ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کا عروج نظر آتا  
 ہے۔ پروفیسر زینت ساجدہ کے الفاظ ہیں:

" مہاراجہ حیدر آباد کی تہذیب و شائستگی کا  
 کا نمونہ مشرقی روایات کا زندہ پیکر ہندو  
 مسلم اتحاد کے علمبردار وجود و سخا کا  
 مجسمہ تھے۔ ان کی ذات بچائے خود ایک  
 روایت ایک انجمن اور ایک عہد کھئی۔" لہ  
 وسجد کی اس نظم کا ہر بند مہاراجہ کی فطرت کا آئینہ دار ہے۔  
 ایک بند ملاحظہ ہو۔

فیض پاتا ہے تری بزم سے ہر صاحب فن  
 لطف سے تیرے سرفراز ہیں ارباب فن  
 فخر کرتے ہیں تری ذات پہ ابنائے دکن  
 قوم کہتی ہے تجھے غازی نفریق شکن  
 دیکھ اب تنگ چمن رنگ رواداری ہے  
 پھول خاموش ہیں تبلیغ ستم جاری ہے  
 پرو فیسر معنی تبسم نے مہاراجہ کرشن پر شاد کے اوصافِ صدیدہ  
 لہ زینت ساجدہ حیدر آباد کے ادیب " آندھرا پردیش  
 ساہتیہ اکادمی حیدر آباد اگست ۱۹۶۲ء

کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

”مہارا جہ کرشن پر شاد کی ذات سخاوت  
 عالم دوستی تہذیب و شائستگی اور حسن  
 اخلاق کا بے مثال نمونہ تھی۔ شعر و سخن  
 سے دلچسپی انہیں اپنے نانا مہارا جہ چند لال  
 شاداں سے ورثہ میں ملی تھی انہیں عالموں  
 اور شاعروں کی صحبت عزیز تھی اور وہ ان کی  
 دلجوئی اور خاطر داری میں بڑی عقیدتمندی  
 اور فراخ دلی کا اظہار کرتے تھے۔“ لے

ظاہر ہے مہارا جہ کے یہی اوصاف تھے۔ جنہوں نے وہد کو اس  
 نظم کے لکھنے پر آمادہ کیا۔

نظم ”مہا تہا بھی ایک شخص کی تو صیف نہیں، جس نے  
 اپنی فطرت عمل اور عزم اس طرح سے نہ صرف انسانیت کی ہمہ  
 جہت خدمات انجام دیئے بلکہ یہ نظم بھی ایک علامت ہے، امن  
 امان کی، سکون و اطمینان کی، وہد چونکہ اپنی ابتدائی عمری سے  
 لے مغنی تبسم“ فانی حیات شخصیت اور شاعری“ پہلی اشاعت

گاندھی وادی رہے۔ انہیں گاندھی جی کی شخصیت گویا مہر و  
عجت رحم و رحمت کا ایک خوشگوار اور نکھرا ستھرا مجسمہ معلوم  
ہوتی تھی۔ جس نے خدمت خلق کو سچی عبادت کہا تھا۔ و جد  
نے اس نظم کو تین حصوں میں منقسم کیا۔ پہلے حصے کو مہاتما  
کی شخصیت کا آئینہ دار بنایا تو دوسرے حصے کو گاندھی جی  
کے پیام سے لبریز کیا۔

زندگی بھر کسی آنکھ میں بھی	غم کا آنسو جھلکنے نہ پائے
مفاسی نے اجاڑے ہیں جو گھر	ان میں آسودگی مسکرائے
شمع صدق و عفا ظالموں کو	مہر و الفت کا رستہ دکھائے
دین و ایمان کی روشنی میں	ہر مضیبت کدہ جگمگائے
آدمی جان لینا بھلا کر	جان دینے کے گر سیکھ جائے

تیسرے حصے میں و جد نے گاندھی جی سے اصول اہمسا کو پیش  
کیا ہے۔

بزم رفتار موج اہمسا اس میں شامل ہے خون مسیحا  
'جواہر لال نہرو' و جد کی ایک نظم ہے۔ جس میں انہوں نے سابق  
وزیر اعظم محمد مجاہد و جہد آزادی آنچھانی جواہر لال نہرو کی

شخصیت کے ہر پہلو کو نکھار کر پیش کیا ہے۔ بد نظمی کے  
سیاہ دور میں سچی رہنائی اور اعلیٰ درجہ کے نظم و نسق کی  
وجہ سے انھیں شب سیاہ میں تنہا میتار نور سے تعبیر کیا  
ہے۔ و سجد کا مصرعہ ع

نئی حیات ملے سوئے سبھی پیہم سے

بڑا ہی بلیغ ہے۔ آزادی کے بعد بد نظمی اور فرقہ وارانہ  
فسادات کی وجہ سے عوام پر جو افسردگی اور پشیمردگی  
چھائی تھی۔ جواہر لال کی دوراندیشی اور مدبرانہ تنظیمی صلاحیتوں  
کے باعث اس کا ازالہ ہوا اور سکون و اطمینان کی فضا پیدا  
ہوئی جس کو شاعر نئی حیات۔ بے تعبیر کرتا ہے۔  
شرفشاں ہے مسلسل قروتی تری

مسافروں کیلئے چھاؤں ہے گھنٹی تری  
(جواہر لال نہرو)

و سجد کی نظر جواہر لال کے بعد ان کی تمام مقام اندر پر یہ درشنی پر جی  
اور انھوں نے بھی نے اپنی صلاحیتوں اور اس شجاعت سے جلد ہی  
ہندوستان میں جیسی عظیم سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے لی تھی۔

ان کی اس حیرت رندانہ پر سب رشک کرنے لگے۔ شاعر نے انہیں ط

’عزیز راہ نما‘ شیر دل ’عقاب نظر‘  
جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ضمیر قوم کا  
پاسباں کہا ہے۔ وجہ کو اندرا گاندھی سے جو عقیدت ہے  
اس کا اظہار نظم کے ہر مصرعے سے ہوتا ہے جہد مسلسل پر  
کرنبر رہنے والی اس شخصیت کیلئے یہ نظم بجا طور پر  
ایک نظرانہ عقیدت ہے۔ ۵

۵ سرور عزم و عمل امتیاز ہے تیرا  
شکست و فتح سے دل بے نیاز ہے تیرا  
وجہ کو اندرا گاندھی کی شخصیت میں بیک وقت جو ایرماں تھرو  
اور مہاشا گاندھی کی خصوصیات نمایاں دکھائی دیتی ہیں  
۵ ستم کشوں کیلئے لطف کا پیام ہے تو  
ستم گروں کیلئے تیغ بے نیام ہے تو  
بلال و جمال گویا پہلو بہ پہلو ان کی شخصیت میں پائے جاتے  
ہیں۔ ایک قابل مدبر سلطنت کی تعریف جن الفاظ میں ممکن ہے



انھیں و جد نے بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ مندرجہ  
 بالا منظومات میں کانگریس سے ان کی دلچسپی بھی مترشح  
 ہوتی ہے۔ اور کانگریس سے ان کی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔  
 ان منظومات کے علاوہ والد مرحوم 'اشفاق' کے  
 نام 'اور شیخ چاند جیسی منظومات بھی لکھی ہیں۔ جو کہ اپنا کوئی  
 سیاسی یا تاریخی پس منظر نہیں رکھتیں۔ یہ تینوں منظومات و جد  
 کی ابتدائی کاوشیں ہیں۔ اور اتفاق سے تینوں مسدس کے  
 فارم میں لکھی گئی ہیں۔ جب کوئی مفکار منظر عام پر آتا ہے  
 تو پہلے اس کی نظر اپنے لوگوں پر پڑتی ہے۔ اور وہیں سے  
 اپنے لئے مواد حاصل کرتا ہے۔ انھیں شخصیتوں سے متاثر  
 ہوتا ہے جو بالکل قریب ہوں۔ ایک طالب علم کی حیثیت  
 سے و جد نے شاعرانہ زندگی میں قدم رکھا تو والد کی مفارقت  
 کا زخم انھیں کروٹ لیتے نہ دیا۔ حساس دل شاعر کو اس کا  
 بڑا افسوس تھا لہذا انہوں نے مرحوم پر ایک مرثیہ لکھا  
 جو بڑی غیر جانبداری کا مظہر ہے۔ چار بند پر مشتمل اس مرثیہ  
 میں مرحوم کی ہر خوبی کو سمو دیا گیا ہے۔۔۔

تھارہ مستقیم کا جاننا زشتہ سوار

مقبول خلق عاشق آقا کے نامدار

مظلوم کار فیق غریبوں کا انگسار

غیر دل کا درد مند عزیزوں کا جانثار

اہل وطن کو تحفہ انصاف دے گیا

گنج متاع حسن عمل سا کھلے گیا

اس طرح و جد کے عزیز دوست شیخ چاند کی جوانی کی موت

نے بھی ان کے تار احساس کو مضطرب کیا۔ کہتے ہیں سرنابو

خیر ہر کس کو ہے ہی ۛ

ۛ لیکن شباب میں بہ مناسب نہ تھا سفر

دل خون ہو گیا تیری لیے وقت موت پر

و جد نے شیخ چاند کو نہ صرف بحیثیت ایک دوست بلکہ

ایک محقق ادب کے ناطے سے بھی یاد کیا۔ اور انھیں خراج

عقیدت پیش کیا ہے ۛ

ۛ ماسم کریں گے قدر شناس ادب ترا

تحقیق پر ملازم رہا روز و شب ترا

نقاد نام دل سے سجلائے کب ترا

رودینکے ذکر آئے کا محفل میں بے ب ترا

بے مثل و بے غزن تھیں وہ اکوشیاں تری

ہاں مقبرے کو بار ہیں خاموشیاں تری

اس نظم کو ہم مرثیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ نظم شیخ چاند و بندوں پر

مشتعل ہے۔ جہاں تک نظم "اشفاق" کے نام کا تعلق ہے

مذکورہ بالا دونوں منظومات سے الگ اپنی نوعیت کی منفرد

نظم ہے۔ اس میں و جد نے اپنے عزیز ترین دوست اشفاق

کو "اچ" سی، ایس کے مسابقتی امتحان میں ناکامی پر رنجیدہ

دیکھ کر لکھا تھا۔ اشفاق حسین و جد کے اورنگ آباد کے

تعلیمی دور سے ساتھی رہے۔ یہ نظم چھ بندوں پر مشتمل

ہے۔ ناکامی کے بعد اشفاق حسین نے جب ہنرمند ادب

سے دور ہونا چاہا اور مسلسل بے روزگاری کی وجہ سے

ان میں ایک بیزاری سی پیدا ہوئی، تو و جد سے دیکھا نہ گیا

اور انہوں نے اپنے تاثرات کو نظم کی صورت میں ڈھالا۔

اس نظم سے مستحق مرزا ظفر الحسن رقم طراز ہیں:

پیران جامعہ اور یاران جامعہ کے بہت  
 بڑے اجتماع میں سکندر علی وسجد نے حکم  
 دیا۔ اے طالب علم تھا۔ ایک نظم سناتا کہ  
 ہمیشہ کی طرح بے پناہ داد حاصل کی تھی  
 اس نظم کا ایک شعر جو بعد میں سکندر نے  
 منسوخ کر دیا اور اب اس کے کسی مجموعہ  
 میں نہیں.....

ناقد ری ہنر کی شکایت فضول ہے  
 یاں ہر گدھے کی پیٹھ پہ اٹلس کی جھول ہے " " لہ  
 سجد کے مجموعہ "لہوترنگ" میں پورا قطعہ یوں درج ہے  
 انہوں نے مصرعہ "یاں ہر..." کو مجموعہ میں محذوف کر دیا  
 ہے " " ناقد ری ہنر کی شکایت فضول ہے  
 آئین نیا نہیں یہ پرانا اصول ہے  
 اصلاح انتظام جہاں تری بھول ہے

یہ شعرانظر الحسن "ذکر یار علی" حاکم کی نو پہلی کتاب "حیرت" (۱۹۸۹ء)

یہ تنگ ہے حیات گرامی کے واسطے

سیارورہا ہے جنسِ غلامی کے واسطے

سکندر علی و سحر کو ابتدا ہی سے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی

رہی اور نگ آباد کے قرب و جوار کا ماحول اس ذوق کو ہوا

دینے میں بڑا کارگر ثابت ہوا۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنا

اور بات ہے اور اس کا ماہر ہونا الگ ہے۔ وجہ کی فنون

سے دلچسپی نے پہلے تو ان کو ایک شاعر بنا دیا۔ اور بعد میں

اجنتا، ایلورا جیسی منظومات کا خالق۔ ان کے علاوہ و سحر کی

فنونِ لطیفہ سے دلچسپی نے انھیں ایسی شخصیات پر کھ

توجہ کو مرکوز کرنے پر مائل کیا۔ جو فنونِ لطیفہ کے ماہر اور

بکہاں رہے طیبہ، رقاہ، بیروین، سلطانہ، نعمتہ کی موت

بطور خاص پیش کئے جا سکتے ہیں۔

طیبہ کوئی پیشہ ور گلوکارہ نہیں بلکہ حیدرآباد کے ایک محترم

خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ عطیہ شیری کفاری و لجن داؤدی

انھیں قدرت نے بچپن ہی سے ودیعت کر رکھا تھا۔ ان کی

آواز بوجہ مدھر لگتی ہے، وہ سورج کے سمندر میں کروڑ

لیکھنا شام کا سماں پیدا کرنے والے انداز سے ملتا جلتا ہے  
 جس کا احساس ہمیں نظم کی ہمیں میں بھی ملتا ہے۔ جہاں شاعر  
 کو کی ہم کی رنگین و مدھن تیس طیبہ کی غیتھس م واز کا تصور آتا ہے  
 و جہاں اپنے ممدوح کیلئے ایسے مصرعے باندھتے ہیں کہ جی  
 عش عش کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس سے بہتر انداز  
 میں کوئی دوسرا مصرعہ وہاں موزوں ہی نہیں۔ یہی رکھ رکھاؤ  
 و سجد کی منفرد خصوصیت ہے۔ اس نظم میں بھی ملتا ہے۔ ایک  
 شعر ہے یہ

ماہِ داغجم سے ہم کلام ہے تو!

بربطِ روح مسیح و شام ہے تو

فکرو فن جب دونوں ہم آہنگ ہوتے ہیں تو فنکار کی عظمت  
 اور نیرہ جاتی ہے۔ یہی حال اس نظم کا ہے کہ طیبہ کی تان میں  
 نہ صرف فکر کی بلندی ہے بلکہ نرم آنچ کا سوز بھی ہے  
 بودلتشیں، دلنوازی اور دل افروز ہے۔ ان کی دلتوازی دراصل  
 ساحر کا ہے جس کی وجہ سے بخودی کا سماں پیدا ہو جاتا

ساحری ہے کہ خوشنواٹی ہے

نرم پر بے خوری سی چھائی ہے

وجہ کی نظم رقاۃ بھی تارا جو دھری سے متاثر ہو کر  
 لکھی گئی ہے۔ رقاۃ ایک نظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شعر  
 بھی ہے جس میں ایک رقاۃ کے سراپا کے ساتھ ساتھ رقص  
 کے ماحول اور اس کے اثر و کیفیت کو دلنشین انداز میں پیش  
 کیا گیا ہے۔ کہ تصورات میں رقاۃ کا رقص اور اس کے کرشمے  
 سب کچھ سما جاتے ہیں۔ یوسف ناظم نے بجا طور پر رقم کیا  
 ہے۔ " رقاۃ کو بھی انہوں نے رکسی مصالحت

کی بنا پر ) سننے کی چیز بنا دیا تھا " لے

' رقاۃ ' میں رقص کے پیچ و خم، حلال و حلال اور کمال فن  
 کو یکجا کر کے وجہ نے اس کی عظمت کو اور بھی دو بالا کر دیا ہے  
 بدن زندگی کا چمکتا پیالہ

چمن کی بہاروں نے پھولوں میں پیالا

لے یوسف ناظم کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں و کتابت

جنوں کو نزاکت کے قالب میں ڈھالا

انگوں کی لہروں پہ باہر نکالا

سنگوں کی جنت دلوں کا اچالا

جماں اجنتا جلال ہمسالا

اٹھی موج مئے کی طرح انجمن میں

تڑپنے لگیں خلیاں جان و تن میں

قد دلیر با حسن بے باک خنجر

لالی بھویں روئے روشن پہ بے گل

مدیرا بھرے نین مستی سے بوجھل

لطاقت جسم جوانی مکمل !

نظر شعر رفتار لغہ مسلسل

چھلکتے ہیں گھنگرہ چھٹکتی ہے پائل

عجیب رنگ سے روشہ کر رہی ہے

سہ بزم قوس قزح بن رہی ہے

تص کی ابتدا کچھ ایسے ہوتی ہے جیسے اندھیرے میں شتاب

شعل جلی ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے بوش مستی میں



طاؤس رقصاں ہے۔ ہر اداسے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

رقص و راگ سروتال کے تاملیں سے حسن فن کی ابتدا ہوتی ہے۔ وسجد کی فنون لطیفہ سے دلچسپی اس نظم کی معرکہ ہے۔ ورنہ رقصہ کے سراپا پر کتنے ہی شعراء نے قلم اٹھایا۔

لیکن اس انداز سے اسکو پیش کرنے سے قاصر رہے۔ 'نغمے کی موت' اور 'پروین سلطانہ' میں بھی انہوں نے ان کے فن کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ کلاسیکل موسیقی کے ماہر فنکار و گلوکار استاد امیر خاں ساٹھ سال کی عمر میں جب کار کی زد میں آ گئے اور جان بحق ہو گئے تو۔

موسیقی کے دلدادہ و شیدا و جد بے حد متاثر ہوئے اور نظم "نغمے کی موت" کو تلمیذ کیا۔ عنوان "نغمے کی موت" ہی سے یہ واضح ہے کہ وہ استاد امیر خاں کو منفسد و گلوکار سمجھتے تھے۔ جن کی آواز میں دریا کا مد و جزر اور چاندنی کا سا سکوں ہے تو ہر تان گویا شاہکار نغمہ نغمہ سرائی کے گر سے واقف، فکر و فن سے بخوبی آگاہ۔ جب ان کا انتقال ہوا تو وجد نے کہا تھا۔

ساز و ساز کے نفس کا راز وہاں تھا

راگوں کا تین پاسباں تھا

نغمے کا نظام جانتا تھا

ایک ایک مقام جانتا تھا!

مہلت نہ ملے مگر بیان کی

اک آہ میں ختم داستاں کی

اسی طرح سرزمین آسام کا تارہ جب سپہر موسیقی پر  
چمکا تو ہندوستان بھر میں اس کا بول بالا رہا۔ پروین سلطانہ  
کو یہ دولت کچھ ورثے میں اور کچھ اپنے استاد بڑے غلام علی  
کی تربیت سے ہاتھ آئی۔ لیکن انہوں نے فن کو اس قدر اپنایا  
کہ خود ان کے استاد ان سے بہت پیچھے دکھائی دیتے ہیں  
ان اپنے کے دوران کبھی کبھی استاد امیر خاں اور بڑے  
غلام علی خاں جیسے باکمالوں کے ہاں بھی سر ٹوٹنے کا  
اندیشہ رہتا اور کبھی کبھار ٹوٹ بھی جاتا تھا۔ لیکن  
پروین سلطانہ کو فن اور خود اپنے سر پر اتنی گرفت ہے کہ  
انہوں نے ایسا موقع آنے ہی نہیں دیا۔ پروین سلطانہ

ہندوستان کا سبکی موسیقی کی مانی ہوئی گلوکارہ ہیں۔ انہیں  
۱۹۷۱ء میں بہترین گلوکارہ کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ وحید نے  
ان پر ایک مختصر مگر جامع نظم لکھی ہے۔

ہر تان کی پرواز کا اعجاز تو دیکھو

تو دسا ہے بے حال یہ انداز تو دیکھو

اس غیرت اہید کی ہر تان ہے دیک

شعلہ سا چمک جلے ہے آواز تو دیکھو

یہاں وحید نے تظہیں کے سہارے فانی کے اسماعیل

شعلہ سا چمک ..... آواز تو دیکھو

استعمال کر کے اس نظم کو پر شکوہ بنا دیا ہے "نبلی ناگن"

کبھی ایک یورپین وائلن نواز یوحین روشانسکی کا

متاثر ہو کر لکھی ہے لیکن یہاں وحید فن کی بجائے

فن کار کو پیش کیا۔ اس نظم میں جذبات کا ہاؤ صاف اور

تیز دکھائی دیتا ہے۔

یہ چہرہ نکلا گوں یہ مہکتے ہوئے گیسو

یہ رنگ شفق میں ہے نہ پھولوں میں نہ شبنم

اب دیکھئے ۛ

دھکے ہوئے سونے کی طرح زلف کی زنگیت ۛ  
آنکھوں میں نظر بند ہیں نسیم کے شرارے  
وحید نے اس طرح اپنی منظومات میں ہر شعبے  
کے اور ہر زمانے کے ماہر فن و تالیفی شخصیات کو اپنا  
موضوع بنایا۔ ان کے علاوہ اس زمرے میں ہم منظومات  
”نکتہ چیں“ اور تحسین اشناس“ کو بھی شامل کر سکتے ہیں  
جو بعد میں بعنوان ”تبصرہ نگار کے نام“ شائع ہوئی تھیں  
ان دونوں منظومات میں غزل کا سارنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن

انداز بیان یہ ہے وحید حسن پرست تھے۔ اور ہر چیز کے  
محاسن سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے تنقید یا نکتہ چینی تو  
دور کی بات ہے۔ کسی چیز کے قبیح پہلو پر بھی ان کی نظر  
نہیں رکتی تھی۔ پھر کھلا اس پر اعتراض کیوں نہ ہوتا جو اچھے  
بھلی چیزوں میں کیڑے نکالتے ہیں۔ نکتہ چیں سے مخاطب  
ہو کر کہتا ہے ۛ

۱۔ فردوسِ نظر ارہ ہے مرا حسنِ نظر دیکھ

بکھرے ہیں ترے سامنے کیا لعل و گہر دیکھ

اور انہیں کہا ہے ۲۔

گلزار ہو بے خار یہ ممکن نہیں ناداں

کانٹوں میں الجھنا نہیں اچھا گلِ تر دیکھ

اس طرح متنبہ کرنے کے باوجود جب تبصرہ نگاروں کی نظر  
کانٹوں میں الجھ کر رہ گئی تو انہوں نے تحسینِ ناشناس کے  
زیر عنوان ایک نظم لکھی۔ ۳۔

کیا تجھ کو دکھاؤں در شہوارِ مصلیٰ      نایاب جہاں میں ہر دیدوری ہے

وصیفِ کمالات جنوں مری عبادت      تنقیصِ ترا مشغلہ خوش بسری ہے

تاریکِ ضمیروں پہ اثر کر نہیں سکتا      اشعار میں جو سوزِ عالمی ہے

تحقیق ہو تنقید ہو تقریر ہو کچھ ہو      ہر حال میں مشکوک تری معبری ہے

اس طرح تبصرہ نگار کا خیر لینے کے بعد کہتے ہیں ۴۔

افکار کی پر نور فضاؤں کے سفر میں      خفاں کو ناحق ہوس ہم سفری ہے

اردو کے گلستاں کا ہے یہ بھی المیہ      ہر یوم کو دعویٰ ہے کہ وہ کبکبائی ہے

تاریخی شخصیات کے علاوہ و سجد نے تاریخی عمارات و مقامات

سے بھی اثر قبول کیا۔ نہ صرف اورنگ آباد بلکہ سرزمین ہند  
 کی کئی تاریخی عمارتیں جن سے ماضی کی حسین و آن مٹ کہانیاں  
 وابستہ ہیں۔ اور وہ مقامات جہاں فنکاری کے گراں بہہ  
 خزانے مدفون ہیں۔ ان کی منظومات کے عنوان بنے ہیں۔  
 سلسلے میں ان کی منظومات 'تاج محل'، 'اجنتا'، 'ایلورا'،  
 'بلور خاص' پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں قدیم ہندوستانی  
 فن 'تعمیر'، 'سنگ تراشی'، و 'تجارہ گدازی' (ایلورا) نقاشی  
 و مصوری (اجنتا) کے علاوہ ہندوستانی فن 'تعمیر' کی کاری  
 کے نادر نمونوں (تاج محل) کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ و جبکہ  
 ادبی دنیا میں انہیں پیش کر کے فن تعمیر کو ابدیت عطا کیا ہے۔  
 ان کے علاوہ و جبکہ ان مقامات کو بھی شعری پسکر میں ڈھالا ہے  
 جو آج کل کی تہذیب کے مظہر ہیں 'علی ساگر' نظام آباد کے قریب  
 واقع ایک خوش منظر مصنوعی جھیل ہے۔ جس کو عصری ضرورتوں  
 کی تکمیل کیلئے نیارنگ و روپ دیا گیا ہے۔ و جبکہ نظم 'علی ساگر'  
 میں اس جھیل کے پس منظر اور پیش منظر کی تصویر کشی کی  
 ہے۔ یہ مصرعہ

ع علی ساگر میں عسزیم کا مرانی موبزن دیکھا

اسی طرح ایک اور مصرعہ ع

ع صفا کشتوں نے یہ رحمت کا دریا کر دیا ہماری

اس جھیل سے اپنی وابستگی کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

حب الوطن کا عنصر جھلک جھلک پرتا ہے۔ بند ملاحظہ ہو

تری خاکِ جن کو میاں پلوں سے اٹھایا ہے

گھل وریاں کو تیرے اپنی آنکھوں سے لگایا ہے

تری براغنائیوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے

تری تعریف کے نغمے تجھے پہروں سنایا ہے

مری آواز کی تجھ کو رہے گی آرزو برسوں!

مجھے بھی اے علی ساگر کرے گا یاد تو برسوں

عصر حاضر کی سائنسی، صنعتی و تہذیبی پیش رفت کو دیکھنے

جن منظومات میں پیش کیا ہے، ان میں جوہرِ بسمِ امن کا کچھول

اور سالار جنگ میوزیم، اہم ہیں۔ سالار جنگ میوزیم نواب

میر یوسف علی خاں سالار جنگ کا تہذیب کدہ ہے۔

جس کو انہوں نے اپنے ذوق و شوقِ ذاتی مالیت اور علمی

کوشش سے علم، تہذیب اور تمدن کا مرکز بنایا ہے۔ اس میوزیم  
 میں فنون لطیفہ کے علاوہ دیگر نادر و نایاب اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ  
 کے شاہکارِ دل و نظر کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ فن پارچہ باقی،  
 شیشہ گری، سنگ تراشی، یوب تراشی، مصوری کے نمونے  
 اعلیٰ پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ جب وہ جدتہ تہذیب  
 رفتہ کے اس 'ایوان' سالار جنگ میوزیم کو دیکھا تو اپنے  
 تاثرات کو یوں قلمبند کیا ہے

کیا دولت بیدار ہے اربابِ نہر کی،  
 قیمت ہے یہاں بیچ و لعل و گہر کی،  
 یہ گنج گراں مایہ تہذیب و تمدن،  
 معراج ہے حسنِ عمل و ذوقِ نظر کی

میوزیم میں اسی حسنِ عمل اور ذوقِ عملی کی کار فرمائی ہے اور  
 معراج بھی۔

ہندوستان نے پر امن ایٹمی تجربے کئے تاکہ قومی  
 ترقیات کو تیز کر دیا جائے۔ وہ جدتہ نے اس کو نیا پھول سے  
 تعبیر کیا۔ لیکن ان کے مجموعہ کلام بیاضِ مریم میں یہ نظم "امن کا پھول"



بن گئی۔ و سجد نے جہاں تمدن گزشتہ کو شاعری میں سمویا  
وہاں تہذیب حاضر کی بھی اپنے کلام میں آئینہ داری کی۔  
و سجد کے الفاظ میں یہ ایک نئے دور کا آغاز ہے۔  
امن کا پھول کھلا

دور پہنچی سے چٹکنے کی صدا پر خوشبو

آج خوشیوں کا اُمیدوں کا سہانا دن ہے

اب و سجد کو یاد آتی ہے ان لوگوں کی، ان بہادروں اور جیالوں

کی جنہوں نے اس عظیم کامیابی کیلئے اپنا خون پسینہ ایک کیا

جواہر لان ایک ایسا بہادر اور جیالا انسان تھا اسی نظم میں

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

خوشنما خواب جواہر نے جو دیکھا تھا کبھی

اسی کی تعمیر سے روشن ہے گلستان وطن

سارے ہمسایوں سے کہندو کہ یہاں

دوستی اور مروت کی بہار آگئی ہے

شعریت کی فراوانی جیسا کہ ان کی ہر نظم میں ملتی ہے

اس نظم میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک آزاد نظم ہے

جو بندھے نکلے قوانین اصول و ضوابط کے والہ و شیدا  
و جد کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی۔ و جد نے اس نظم کو  
ردیف و قافیہ کے بندھن سے آزاد کرنے کی کوشش کی  
تاہم یہاں یہاں ان پائپنڈوں کی کارفرمائی ضرور ملتی  
ہے۔

شعر مارلین منرو، عہد آفریں دس سال، و جد کی  
معراء منظومات ہیں، جو اس کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اول الذکر  
دونوں منظومات میں ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی لیکن  
موجہ الذکر، عہد آفریں دس سال، میں پھر وہی قافیہ پیمائی  
کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مصرعہ ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸  
ہم قافیہ ہیں۔

۱۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سر راہ وقا۔

۲۔ اک بے باک عمل مست داں آویز کریں۔

۳۔ آئی پر نور سویرے کی بشارت لے کر۔

۴۔ شمع کا سر عیا فرض کا آغاز ہوا۔

۵۔ من کا پھول کھلا سلم کا تارا چمکا۔

آج پھر تازہ ہواؤں سے کہتا ہے جیتا۔ ۲  
 کھتا کہتا ہے کسی آنکھ میں آنسو نہ رہا۔ ۱  
 تھلا تا ہوا رخصوں سے وطن گزرا ہے۔ ۴  
 ابھی دکھ درد کی بھٹی ہوئی پلکیں ہیں مگر۔ ۳  
 مسکراتے کاغذ پیسوں کو سہارا تو ملا۔ ۱  
 سرد الفاظ نے صدیوں میں زبان پال دی ہے۔ ۲  
 کس کی بہت سے یہ دلدار سحر آئی ہے۔ ۴  
 وسعہ کی نظم 'شملہ' میں حقائق زندگی کو پیش  
 کیا گیا ہے۔ جس میں شملہ کے مجبور اور مفلوک الحال انسانوں کی  
 بے سروسامانی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ لیکن نظم 'صبح شالا بار'  
 میں صرف فطرت کے حسیان و دنواز مناظر کی عکاسی ملتی ہے۔  
 نظم 'شملہ' کے اشعار ہیں۔

شہر کے ہر راستے پر بھیک روکا شور ہے

ان پہاڑی میکر وں میں میکشی کا زور ہے

برق کی رو سے دل ہر نہ ہ ہے کیوں داغ

گلاؤں میں بے قیل میں توجہ مٹی کے چراغ

وسجد کی منظومات تاج محل، چترانغ نشاط محل، منوار  
 ملکگیر، علی ساگر اور نگ آباد، حیدر آباد، قیصر وطن،  
 ترانہ دکن اور کی ایم، میں تمدنی و ثقافتی عناصر کی عکاسی ملتی  
 ہے۔ ان منظومات میں ہندوستان کے تاریخی و تفریحی مقامات  
 اور عمارتوں کی وسجد نے بڑی خوبی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے  
 تاج محل سے متاثر ہو کر تقریباً ہر شاعر نے اس پر  
 قلم اٹھایا ہے۔ کسی نے اس کو محبت کی علامت بنا کر پیش کیا  
 تو کسی نے اس کو حسن کا شاہکار کہا۔ اور کسی نے اس کے اندر  
 مستور ان جذبات کو ملحوظ رکھا جو اس کی تعمیر کا باعث بنے۔  
 کسی نے اس کو مقابر شاہی کہا، کسی نے اس کے خطا ہر  
 حسن و جمال پر اظہار خیال کیا۔ جہاں تک سکندر علی وسجد کا  
 تعلق ہے انہوں نے تاج محل کی بناوٹ اور اس کی ساخت  
 پر بڑی فنکارانہ نظر ڈالی، اور فن تعمیر کی لافانی حیثیت کو  
 پیش کیا ہے۔ نظم کے پہلے بند کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔  
 جادو نگاہ عشق کا پتھر پہ چل گیا  
 الفت کا خواب قالب مر مر میں ڈھل گیا

تو اب الفت کو مر میں متشکل دیکھ کر شاعر نے اس کو نظم کا  
جام پہنایا۔ ان کو اس عمارت کے خمیر میں اید کی محبت کا فرما  
نظر آئی۔ جو خود عمارت کی لا فائیت کی غماز ہے۔ تاج محل کی عظمت  
ورفت کے مہر و ماہ تک بھی منکر نہیں سنگ مرمر کے حسین  
گنبد پر منعکس ہوتی ہوئی شمعوں کو دیکھ کر شاعر کی عقیدت  
کے جذبات متحرک ہو جاتے ہیں۔

ہمیت سے تیری دلکشی بے پناہ کی  
گنبد پر کاپتی ہے کرن مہر و ماہ کی  
ہیں کے برعکس وجہ کی فتون لطیفہ سے دلچسپی انھیں  
عمارت کی چیزئیات اور مہر و ماہ کی روشنی میں اس کی دلکشی  
کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ بقول رشید حسین خاں :

”حسن تعمیر کو واضح کرنے کیلئے محتاج محل پر ان کی

جو نظم ہے۔ اس کا صرف ایک مصرعہ کافی تھا۔ ص

چھنتی ہے جانیوں سے تراکت خیال کی“ لے

لے رشید حسین خاں ”وحد کی شاعر چہ شاعر“ وجہ شاعر

مکتبہ جامعہ لئیرٹی دہلی

”چراغ نشاط محل“ بھی وحید کی ایک بہاریہ نظم ہے۔ جس میں  
 ماضی کی تابندہ یادوں کی جھلک ملتی ہے۔ یہ نظم شاعر کے رجائے و  
 طہسیرِ رحمان کی غماز ہے۔

دل و نگاہ پہ مثل خمِ سارچھائی ہے  
 ہنوز کیفیتِ عشرتِ زمانہ دوست

نظم ”مزارِ عالمگیر“ میں شاعر نے اور نگزیرِ عالمگیر کے  
 دورِ حکومت، اس کی عظمت و شکوہ اور اس کے جاہِ مجلال کی تصویر  
 کھینچنے کے بعد اس کی موجودہ حالت کی بھی عکاسی کی ہے۔

ایک ہی انجام ہے کمزور اور شہِ زور کا  
 پیس کر دونوں کو رکھ دیتا ہے کونا گور کا

مزارِ عالمگیر خاک کا ایک تودہ نہیں بلکہ دنیا والوں کیلئے  
 ایک عبرتِ کدہ بھی ہے کہ سطوتِ شاہی بھی منزلِ مہمات سے  
 چھوڑ کر رہے گی۔ موت کی منزل سے ہر شاہ و گدا کو گزرنا ہے  
 اس سے کسی کو مفر نہیں۔

موت نے جو ہر مٹا ڈالا دمِ شمشیر کا  
 ایک ہی سیلاب میں مٹکا ڈھل گیا تیر کا

آخری بند میں شاعر نے زندگی کی بے ثباتی کے فلسفے کو بڑے  
 ہی آسان اور موثر طرز انداز میں نظم کیا ہے اور اللہ باقی اسکا  
 ایک خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے۔

عم ڈھلتی دھوپ ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

دولت دنیا ہے دھوکہ شان و مشوکت کچھ نہیں

شادی و غم دو گھڑی کے عیش و راحت کچھ نہیں

سارے خالی ڈھول ہیں اقبال و عظمت کچھ نہیں

صاف و روشن فیصلہ ہے یہ دل آگاہ کا!

نقش مٹ جاتے ہیں سب تہلے نام اللہ کا

یہ نظم نہ صرف تاریخی حقیقت سے ممتاز ہے بلکہ یہ وجد کی فاسقیا  
 ذہنیت کا آئینہ دل رکھی ہے۔

حیدر آباد اور تگ آباد اور ترانہ دکن جیسی منطیقات

دکن سے وجد کے والہانہ و البستگی کی غماز ہیں۔ ان میں انھوں نے

اپنے تربیت گدروں کی شان کو ٹیسے ہمارے شکوہ ماحول کو چھپانے

کیا ہے۔ یوں تو وحید و سجاد پور میں پیدا ہوئے تھے لیکن انکی تعلیم

و تربیت کا آغاز آوریگ آباد میں ہوا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انکا

پہلے فکر لیریز ہوا۔ لہذا اورنگ آباد سے ان کی یہ وابستگی  
 انھیں نظم اورنگ آباد لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس نظم میں وجہ کا  
 اچھہ مشوئی سے میلی کھا تھا ہے۔ وہی فارم' وہی روایتی انداز  
 بہار یہ و بیانیہ انداز میں اورنگ آباد کی آب و ہوا' مناظر قدرت  
 مظاہر فطرت وہاں کے محل وقوع اور ہسکی تاریخی تہذیبی و  
 ادبی حیثیت کو بڑی ہی خوبصورتی سے نظم کیلئے ہے۔

لڑنے میں ترے آثار کی تو قسیر ہوتی ہے  
 تری آغوش میں تہذیب اہل ہند ہوتی ہے  
 تیرے کہسار میں ہے عزم خلیج بے قرار اب تک  
 فضا میں ہمت تعلق کا اڑتا ہے غبار اب تک  
 ترے دامن میں عالمگیر پھنسی نیند سوتا ہے  
 جلال قطب شاہی اپنی بربادی پہ روتا ہے  
 حصار دہلی میں تری نظا نتیجہ سچی پیرہم کا  
 ترے مشرق سے پہلا آفتاب صفی چمکا  
 دلی کے قلعہ جاں سحر گونجے تیری محفل میں  
 سراج بزم عرفاں سے اجالا ہے ترے محل میں



اس تاریخی و تمدنی تہجد کے بعد شاعر اس مقام سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے ۔

ترے ہی سہارے میں نے سنے تھے جوانی کے  
 ترے بھول میں سکھے ہیں گریب دو بیانی کے  
 شہر حیدر آباد وجد کا پسندیدہ و محبوب شہر ہے۔  
 ان کی تربیت مکدوں میں اس شہر کو دوسرا مقام حاصل ہے  
 لیکن یہ نظم "اورنگ آباد" سے اپنے مواد و ہیئت دونوں زوایوں  
 سے مختلف ہے۔ اس کی ابتدا وہاں کی فضا کے جوں جوں کی  
 دلکشی سے ہوتی ہے۔ حیدر آباد کے ماحول کی جزئیات اور  
 وہاں کی تہذیبی اقدار کو نظم کرنے کے بعد شاعر اپنی حقیقت  
 کو یوں الفاظ کا روپ دیتا ہے ۔۔

اگر مہر و الفت کی بخت کہیں ہے

تو بے شک یہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے

اورنگ آباد سے شاعر کی وابستگی نے ان کو وہاں سے ماحول کو  
 نظم کرنے پر آمادہ کیا لیکن نظم حیدر آباد وہاں سے دور  
 ہونے کے بعد لکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں یہیں

وہ تاثر جھگٹا ہے جو ایک قریب ترین دوست کے فراق سے  
حاصل ہوتا ہے اسکو اس حسین و خوشگوار یاد سے تعبیر  
کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ۔

تری یاد، یاد وطن سے ہے خوش تر  
تراز کر تسکینِ قلبِ حزیں ہے

۱۹۵۶ء میں جب اورنگ آباد اور حیدر آباد دو مختلف  
صوبوں میں شامل کر دیئے گئے تو وجد کے دل پر گویا بجلی سی  
گری انہوں نے لکھا ہے ۔

زمانہ دل آزار ہے کبھی تو گیا غم  
مجھے تری دلدار یوں کا یقین ہے

ترانہٴ دکن اور نذر وطن بھی وجد کی شاعرانہ  
زندگی کے دو مختلف ادوار کی پیداوار ہیں۔ نظم "ترانہٴ دکن"  
وجد نے آزادی ہند سے پہلے رقم کی تھی۔ جبکہ "نذر وطن"  
بالکل بعد کی تخلیق ہے۔ ترانہٴ دکن میں شاعر دکن کو بہشت  
سے الگ تھلک دیکھتا ہے۔ اس کی انفرادی خصوصیات  
سے اس کو یاد کرتا ہے۔ شاید یہ اس وقت کی ایک عام بات

تھی۔ کیونکہ بقول ثانی بدایونی یہاں کے لوگ مڑ

ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور  
کے مصداق دکن اور صرف دکن کے والہ و شیدا تھے۔ لیکن  
جب شاعر اپنے شعور کی رفعت کو پہنچا تو اس کو حقیقت کا  
پتہ چلا۔ و سجد نے نظم "ندروطن" میں دکن اور شمالی ہند کی  
رنگینیوں کو ہم آہنگ کیا اور مختلف مقامات کی دلکشی کو  
ایک ساتھ بیان کر کے اس کی یو تلمونی کو نکھارا اور اس  
میں ایک نیا عنصر شامل کیا۔ جسکو تمدن سے تعبیر کیا  
جاسکتا ہے۔

کہیں جواب نہیں ترے کہساروں کا  
سماں عجیب ہے گنگ و جمن کے دھاروں کا

مثال قوس قزح رنگ کشت زاروں کا

فضا میں عطر ہے تہذیب کی بہاروں کا

زمانہ تیرے فسانے کھلا نہیں سکتا

لقوٹش تاج و اجنتا مٹا نہیں سکتا

شاعر نے تاج و اجنتا کے تالیں سے جو نکھر استھرا

قصور ابھار رہے وہ فنکاری کا نا در نمونہ ہے جو (INDO)

(SARACENIC) ہند الما لوی تہذیبی و تعمیری نمائندگی

کہتا ہے۔ جو اجنت اخالص ہندوستانی اور تاج خالص  
الما لوی فن تعمیر کے نمائندے ہیں۔ وجہ تے اس قسم کی  
تاریخی منظومات میں ستمی اثاثے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو اس  
دور کی یادگار ہوتے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی ثقافت  
تہذیب اور فکری بلندی سے متعلق اشارے کنایوں  
ہی میں سہی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ فن کو جب تک فنکار کے  
خونِ دل و جگر سے سینچا نہ جائے اس میں شادابی نہیں آسکتی  
اور فنکار جب تک اپنا رشتہ سماج سے استوار نہیں کرتا خونِ دل  
و جگر بہم نہیں ہو سکتا۔ لہذا مہر فن سے اپنے دور کے سیاہی  
و ثقافتی عناصر ضرور منعکس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مجید بیدار  
کے بموجب :

ایسا ادب جو تمدنیات کی عکاسی کرتا ہو۔ اس پر

لازم ہے کہ وہ ان ضرورتوں کی سناسندگی کرے

تاریخی یادگاریں، ستمی اشارے ثقافتی جھلکیاں

وخت کے کلام میں پہلی بار ان چاروں عناصر کا سنگم  
نظر آتا ہے۔ ایک نرالا اور انوکھا سنگم جو خوبصورت بھی  
ہے اور کھرا مد بھی ہے

کمند گردش ایام کے اسیر نہیں

نوش دست عقیدت فنا پذیر نہیں

اجتائیں کل ۲۹ غار پہاڑوں میں تراش کر بنائے

گئے ہیں جن میں بدھ مت کے ۲۴ روار اور ۵ ردیول ہیں۔

اجتا کے غاروں میں جو دیواری تصاویر بنائی گئی ہیں۔ ان میں

قدیم ہندوستانی فن جھلک جھلک پڑتا ہے۔ رنگ آمیزی

کے دوران قد و قامت کے تناسب کو باقاعدہ ملحوظ رکھا

گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ وہاں چانک روٹا ہوئے ہیں

حالانکہ اس میں صدیوں کی سعی انسانی مستور ہے

جہاں خون جگر پیتے رہے اہل ہزبر سوں

جہاں گھٹا رازگوں میں آہوں کا اثر سوں

اے ڈاکٹر مجید سید! وخت کی شاعری میں تمدنیات! ہندو سب سے حیدر آباد کوٹ

اس تہذیبی وادی کو شاعر نے اپنی چھٹی حس سے محسوس کیا  
 اور الفاظ کے پیرائے میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے۔ نظم اجنتا  
 کو وجد نے مسدس کے فارم میں لکھا۔ جس میں کل گیارہ بند ہیں  
 اور ہر بند اپنی جگہ بھر پور اور معنی خیز ہے۔

مہذب وادی میں خوشنما نمونوں کی وجہ سے سوداگشی  
 آئی ہے۔ وہ وہاں کے ماحول کو خوش منظر بنا دیا ہے۔  
 شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں  
 بہار زندگی غلطالہ سے سبزے کی اداؤں میں  
 اور پھر کہتے ہیں۔

یہاں صدیوں سے کئی پر سکون شہر میں مقامی ہے  
 یہاں کا درہ درہ منظر شانِ جمالی ہے

اس وادی کو پائے تکمیل تک پہنچانے کیلئے جس عزم و ارادے  
 کی ضرورت تھی وہ عزم عزم کو تم سے کچھ کم نہیں تھا۔  
 ان غاروں کو شاعر نے جام جمشید سے تشبیہ دی ہے جس  
 میں اس دور کے تمدن کو دیکھا جاسکتا ہے۔  
 تمدن منعکس ہو جس میں ایسا سا عزم ہے

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تہذیب کا قافلہ امن کی تلاش میں شہر سے باہر ان پہاڑوں میں ہو آیا لیکن فسون کاروں نے اس کو اپنے جادو کے بل پر ساکت کر دیا انہیں جاودانی بخش دی۔ مختلف غاروں میں مختلف واقعات کی تصاویر موجود ہیں۔ ان تصویروں میں سدھارتھ کی تخت نشینی بدھ مت کی ابتداء عروج و زوال تک کے پورے پورے واقعات کی مرقع کاری کی گئی ہے گویا ان غاروں میں پوری ایک دنیا بسی ہے۔

کہیں پیدا ہے ساری کیفیت صحن گلستاں کی  
کہیں رولتی نظر آتی ہے بازار و شبستاں کی  
کہیں حیرت زبان حال ہے حال پریشاں کی

لکیریں ہیں کلمہ شریا نہیں دل انسان و حیوان کی  
کہیں ظلمت کے پیچھے روشنی محسوس ہوتی ہے  
کہیں تو موت میں بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

اس بند کا آخری مصرعہ بلیغ معنی لئے ہوئے ہے۔ یہ اس تصویر کے اطراف اشارہ ہے جس میں بدھ کے ارتحال کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں سدھارتھ کی موت پران کے پیروؤں کے جذبات

غم و اندوہ، حیرت و افسوس کی ملی جلی کیفیت کچھ اس طرح جھلکتی ہے کہ ہمیں اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ لہذا شاعر نے اس منظر مات میں زندگی کا جوہر پیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بودھی نستو پدما پانی کی تصویر بھی منفرد خصوصیات کی حامل ہے و جد کو جزئیات نگاری میں بڑا کمال حاصل ہے۔

ارباب فن کی سعی پیہم کا نتیجہ ہے کہ ان پٹانوں میں شباب و حسن کا دریا رواں ہے۔  
لا ہے زندگی کو بانگین ان کج کلاہوں سے

نظر والوں پہ شمشیریں برسبستی ہیں لگا ہوں سے  
ان نقوش کو جو ثبات حاصل ہے وہ بھی ان ارباب ہم کی کاشتوں  
کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے اپنے خون دل و جگر سے ان نقوش میں لالی  
بھردی ہے۔

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لائانی  
تصدق جن کے ہر خط پر تحسید خاتم مانی  
مشکل ہے شباب و حسن میں تخیل انسانی  
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عوامی



حسینان اجنتا کا جنوں سرتاج ہے گویا  
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بقول ڈاکٹر وحید اختر :-

” وہد کی اکثر استوائی نظیں جن میں ان کے شاہکار

بھی شامل ہیں مسدس کے فارم میں ہیں اور انیس  
کے فنی کہاں کی بازگشت ان میں ملتی ہے مگر جو

شاعر یہ کہہ سکے ط

’ تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی‘

اپنے رویے میں قدامت پرست اور روایت گزردہ

ہرگز نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ جدید ذہن کی

نمائندگی کرتا ہے۔“ لے

۱۹۷۳ء میں جب انجمن اساتذہ اردو جامعات گلندکی

سالانہ تقریب اورنگ آباد میں منعقد ہوئی تو مندوبین کی یہی

خواہش تھی کہ اجنتا اور ایلورا جلتے اور اس کو دیکھنے سے

لے ڈاکٹر وحید اختر ”یاقین مریم کا شاعر“ سہفہ روزہ ”ہماری زبان“

انجمن ترقی اردو نئی دہلی یکم نومبر ۱۹۷۳ء

پہلے اس نظم کو وجد کی زبان سے سن لیں۔ کیونکہ بقول یوسف ناظم  
 وجد نے اجنت الیورا اور تاج محل کو سننے کی چیزیں بنادیا  
 ہے۔ جب حسب خواہش اجنتا سنائی گئی تو اس مصرعہ پر  
 تقریباً ہر مندوب عیش و عشرت نے لگا۔ ع

’ تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عربیاتی‘

تقدس اور عربانیت کو ایک ساتھ اور اس لحاظ سے کہ دونوں  
 میں توازن بھی برقرار رہے کسی اور شاعر نے شاید ہی پیش  
 کیا ہو۔

اسی طرح الیورا بھی ان کی شاہکار ہے۔ یہ بھی اجنتا  
 کی طرح مسدس کے فارم میں لکھی گئی ہے۔ ان غاروں میں سنگ  
 تراشی و مجسمہ سازی کے فن کی معراج دکھائی دیتی ہے۔  
 مئے خیال ہے سنگین آ بگسینوں میں  
 دلوں کا سوز نہلاں پتھروں کے سینوں میں

فنگاروں نے جب اپنے ذوق و شوق سے فن کو فکر و تخیل کے  
 پیر لگائے۔ اور چٹاؤں جیسے مضبوط و مستحکم عرائم سے اپنے  
 نقودات کو پتھروں پر تراش کر دیا۔

تصویرات کے پیکر تراش ڈالے ہیں

دیئے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں

خارہ گدازوں نے مصمم ارادوں سے فن کو معراج پر پہنچا یا ان  
کی نظر عقابی تھی تو ان کے تیشے برق پاروں کے تھے مصائب  
کا انھیں مطلق غم نہیں تھا۔ اپنے تخیل کے زور پر ایسے  
مجسمے بنائے کہ وہ اپنی الگ دنیا رکھتے ہیں۔ ان کے چہروں  
پر جمال و جلال کا ایک حسین امتزاج نمایاں ہے۔ بدھ جین  
اور برہمن مذاہب کے بی شمار اصنام پتھروں ستونوں  
اور قار کی اندرونی دیواروں پر کچھ اس طرح تراشے گئے ہیں  
کہ زائرین وہاں خود کو ان کی دنیا میں پاتے ہیں۔ کیلاش کا مندر  
جو آفاقی شہرت کا حامل ہے انہی غاروں میں سے ایک ہے  
اسکی اہمیت اس طرح بھی ہے کہ یہ مندر زیر زمین صرف ایک  
ہی پتھر میں تراشا گیا ہے۔ یہاں ہندوستانی سنگ تراشی  
کے ایک سے ایک اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ رقص کرتی ہوئی مورتیں  
یہاں جو لہر دار حرکت دکھائی گئی ہے۔ وہ ان فنکاروں کا اپنا

حصہ ہے ۵

ہزار حسد بدماں تھموش آبادی

نزدک کو تھی عرض ہر کی آزادی

یہاں نہیں ہے کوئی نقش نقش قریادی

تلام مرضی حالات حسن کار نہیں

کمال فکر کے شہکار شہتہار نہیں

اکرم حسن اپنی تصنیف شعرو میں رقم طراز ہیں :-

"سکندر علی و جید کی نظموں میں بیانیہ عنصر کا غلبہ

ہے۔ اور اس بیانیہ عنصر سے و جید نے بڑے

بڑے کام لئے ہیں۔ ان کی نظم اجستانہ صرف

ادبیت کے اعتبار سے اس دور کی کامیاب

نظموں میں ہے بلکہ اس میں خیال اور احساس

کے عنصر کو جس پایہ دستی سے یکجا کیا گیا ہے۔

وہ اپنی آپ نظیر ہے۔"

بیانیہ انداز و جید کے ہاں ہر طرز کی منظومیاں ملتا ہے

چاہے وہ قومی ہو یا کوئی اور وجہ کی منظموں میں قومی شاعری کے عناصر کی بھی فراوانی ہے۔ وجہ کی اٹھان کا زائد ہی تھا۔ جس میں آزادی کی جدوجہد کو فروغ حاصل ہوا۔ برطانوی سامراج کے ظلم و ستم تحدیدات و موانعات کے باوجود نازک ترین حالات میں بھی آزادی کا خواہش کم نہیں ہوئی بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کے، مصداق اور بھی بڑھتی چلی گئی اور ہرزبان میں قومی شاعری عروج پانے لگی۔ اس ضمن میں اردو کے شعراء چمکتے جوش اور حسرت کے نام بطور خاص لئے جاتے ہیں۔ سکندر علی وجہ چونکہ ابتدا ہی سے ملک و قوم کے ہر ذرہ کی خوبی کو بیان کرنے میں آگے آگے تھے۔ اس قومی تحریک سے اور زیادہ متاثر ہوئے۔ ابتدا میں وہ 'فرزند جامعہ عثمانیہ' طالب علم، نوجوان سے خطاب اکسان، نئی زندگی، اور آزادی، جیسی منظموں کا لکھ چکے تھے۔ جو اس بات کا اظہار تھا کہ ان میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ فرزند جامعہ عثمانیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تو مشرق زاد ہے غافل نہ ہو مشرق کسے بیڑے سے  
سفینے کو بچا طوفانِ مغرب کے تھپیڑے سے

اور آخر میں ے

ضرورت ہو تو سر بھی نذر ناموس وطن کر دے

جزاک اللہ تازہ قفقہ دارور سن کر دے

طلبہ کی کالمی کو مد نظر رکھ کر انھیں نصیحت کی ہے ے

تراس از علم انہا ہوش ہے مظاہر پیدا کر

یہ راز زندگی ہے سیرتِ سیما پیدا کر

تعاقب میں ترے جلی بھی تھک کر چور ہو جائے

ترے قہقہے میں آ کر وقت بھی مجبور ہو جائے

اس طرح و جد طلباء کو ملک و قوم کی خدمت کیلئے اکساتے رہے

ان کی ایک اور نظم "طالب علم" میں بھی انہوں نے طلباء کو عمل

کی ترغیب دی ہے ے

تفریقِ شب و روز کوئی بات نہیں ہے

تقسیمِ دن اور رات نہیں ہے

اس طرح بہت بہت و پند مردہ افراد کے جوش و جذبہ کو

اجاگر کرنے اور انہیں ٹھیک راستے پر لانے کا مشکل کام ایک

شاعر ہی بخوبی کر سکتا ہے۔ و جد نے بھی اس ذمہ داری کو

بحسن و خوبی انجام دیا ہے

اک تیر کی مانند بلاؤں سے نکل جا

سیماب صفت جلد ہر اک سانچے میں اڈھل جا

بدلی ہے زمانے کی فضا تو بھی بدل جا

مہلک ہے یہاں لغزش پا دیکھ سنجل جا

ٹھوکر جو لگے راہ میں انصاموش نہ چل دے

گرامن کا طالب ہے تو فتنوں کو کچل دے

ان منظومات میں بیانیہ انداز بھی ہے۔ اور خطیبانہ آہنگ

بھی۔ و جد کی اس نوع کی دیگر منظومات میں بھی ان عناصر کی فراوانی

ہے۔ حالانکہ شعر الگ چیز ہے اور مواظت الگ چیز۔ ان منظوما

کے موضوعات ہی کچھ پند و مواظت سے ملتے جلتے ہیں۔ و جد

نے بھی یہاں شاعری کو پند و نصائح سے ہم آہنگ کر دیا

ہے۔ یہ ایک اعلیٰ شاعری کی خوبی ہے جو خطابت میں شاعری

کی ترنگ پیدا کر دے۔ نظم "آزادی" کے یہ اشعار

کھلی ہے حریت کی شاہراہیں  
 خلافت میں پڑے کب تک کراہیں  
 یہ آزادی کا دستور کہن ہے  
 نہیں ملتی اگر قیدی نہ چاہیں

اس نظم میں شاعر نے چاہ اور امکان کے رشتہ کو استوار کرتے ہوئے لوگوں میں شعور بیداری پیدا کرتے ہیں۔

سکندر علی وحید نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام کو گویا ملک کی آزادی کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اس مجموعہ کا نام ہی "آفتاب تازہ" آزاد ملک کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔ آفتاب تازہ میں تقریباً ایک تہائی منظومات صرف آزادی و وطن پرستی سے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے الفاظ میں:

"وحید اپنے دور کے پرشوب حالات کا شعور رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے سماجی شعور میں گیرائی نظر نہیں آتی ان کی چہ نظیں البتہ ایسی

ہیں جن میں روح عصر کی جلوہ گری ہے، لہ

ڈاکٹر حامدی کاشمیری "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" مجلس اشاعت ادب دہلی ۱۹۶۸ء



”ارادے“ بشارت ”صبح تو“ اندیشے ”آفتاب تازہ“ جہان کی فریاد  
 ”نقشِ ناتمام“ نیا دور ”عالم آشوب“ شہر آشوب ”ماحول“  
 ”شملہ“ اور ”عہدِ آفریں دس سال“ منظومات میں روحِ عصر  
 کی کار فرمائی بجا طور پر نمایاں ہے۔ جس میں وطن دوستی کی  
 خوشبو بھی ہے۔ اور شعورِ عصر بھی۔ قومی نظمیں صرف وہی  
 نہیں جن میں ملک و قوم کی تعریف و توصیف کی گئی ہو  
 بلکہ ان منظومات کو بھی اس نذرے میں شامل کیا جاسکتا ہے  
 جن میں وطن سے متعلق کچھ لکھا گیا ہو چاہے وہ تنقید ہی  
 کیوں نہ ہو۔ وحید جلیسے منکسر المزاج شاعر سے بھلا کڑی  
 تنقید کی امید کیسے کی جاسکتی تھی خود وحید کو بھی اس کا اعتراف  
 تھا۔

آتشِ مزاج و سجد میں اب سر کشی کہاں  
 وہ خاک پاٹے اہل نظر بن کے رہ گیا

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک ملک کے ہر کونے سے حصولِ  
 آزادی کے نعرے ابھر رہے گئے۔ یوں بھی یہ واقعات  
 بہت پہلے ہی سے شروع ہو چکے تھے۔ لیکن لوگوں کا بھوش و

جذبہ پروان چڑھتے چڑھتے اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اور  
ساتھ ہی انگریزوں کا جبر و استبداد بھی عوام کو مولیٰ گاجر  
کی طرح کاٹا مبارہا تھا۔ اور قومی رہنما قید و بند کی صعوبتوں  
کا شکار۔ غرض ملک افرا تفری اور بد نظمی کا شکار تھا۔ ایسے میں  
وجہ کی منظومات ہر قدم پر لوگوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔ نظم نیائیت  
میں انہوں نے انگریزوں کی چالوں سے لوگوں کو بخوبی واقف  
کروایا۔

ساتھی ان دور ہی بھاگ      ان کی ہنسی ہنوت کا راگ  
برساتے پھرتے ہیں آگ      دس لیں گے اجلے ناگ

ان کے سروں پر تھپسہ ڈال

ان کو ہر بستی سے نکال

وجہ نے عوام کو نہ صرف انگریزوں کی فطرت سے آگاہ

کروایا۔ بلکہ ان کو تحفظ کی راہیں بھی بتلائیں۔ نظم ارا دے

کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

غلامی کے اندھیرے میں نظر آتی نہیں منزل

چراغِ غزم سے آساں رہ دشوار کرنا ہے

بتانِ سیم وزرِ پیرِ سرنے والے نو جوانوں کو پا

وطنِ پیرِ جان دینے کے لئے تیار کرنا ہے!

یہ مانا چند قطرے ہیں لہو کے قلب میں لیکن

بیاباں کو انہی سے سیراب کر گلزار کرنا ہے!

اس طرح پیرِ مردہ دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتے ہوئے وحید

ان کے اندر پنہاں امکانات کو نمایاں کرتے تھے۔ تاکہ وہ کھیر

تازہ دم ہو کر جہدِ آزادی میں حصہ لیں۔ جب ملک میں مجاہدانِ قوم

کے مقابلے میں انگریزی حکومت قوی سے قوی تر ہوتی گئی اور

انہیں کڑی سے کڑی ترسٹرائس دی جانے لگیں تو ان شہیدوں

کا وحید گوشہ دیدرِ رخ تھا۔ اس رخ و الم کو غلط کرنے کیلئے شاعر

آنے والے کل کا حسین خواب دیکھا۔ اور نظم "بشارت" میں

آج کے پیرِ مردہ چہروں کو کل کی رہنمائی و برائی سے آگاہ

کرایا ہے

آزادیؔ افکار کے گلِ دل میں کھلیں گے

یہ خارِ غلامی کی چھن کل نہ رہے گی

گھانے کیلئے قمری و بلبلی کو چن میں  
 منت کشی زراغ و زغن کل نہ رہے گی  
 یہ دشمن انصاف و کرم ظلم کی دیوی  
 بے کس کا لہو پی کے لگن کل نہ رہے گی

سچ تو یہ ہے کہ ان اشعار میں دبستگی کے جو عناصر  
 مضمر ہیں۔ وہ ہر فتنہ فساد کے موقع پر اکسیر ماسنہ جائیں گے  
 چاہے وہ فرقہ وارانہ فساد ہو یا کوئی اور ہی نوع کا۔ چاہے  
 وہ ہندوستان کا ہو یا پھر دنیا کے کسی بھی ملک کا جہاں بھی  
 ہو ظلم پر بنی حکومت دیر پلہ قائم نہیں رہ سکتی۔ ظلم و ستم  
 کے طوفان کے بعد ہی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ یہ وہ فلسفہ  
 ہے جس کو زود دہس شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔  
 یہی وجہ ہے کہ شاعر لسان العصر بھی ہوتا ہے۔ اور مستقبل  
 کا نقیب بھی۔ اسی طرح نظم "صبح نو" عوام کے عزم و ارادوں  
 میں استقلال کا عنصر شامل کرتی ہے۔

راہِ آزادی میں کیا اندیشہ سودوزیاں  
 ٹھوکر بن کھالو سنبھلنے کا زمانہ آگیا

ہو گیا ہے آگ تپ تپ کر غلاؤں کا ہو

اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانہ آگیا

۱۹۴۷ء کے آتے آتے انگریزوں کو علم ہو گیا کہ اب

ہندوستانیوں کے اندر موجزن بھار آزادی کو روکنا ان کے

لس کی بات نہیں۔ لہذا انہوں نے ایک غلط حکومت تشکیل دی۔

جس میں کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کے نمائندوں کو بھی شامل

کر لیا گیا۔ لیکن یہ تجربہ کار ثابت نہ ہو سکا۔ نظریوں کی غییر آہنگی

نے ہر موڑ پر کشیدگی کھڑا کر دی۔ وسعد نے نظم "اندیشے"

اسی پس منظر میں رقم کیا ہے۔

تیزی سے قدم بڑھا سافر

راستے میں رات ہونہ جائے

تقدیر سے چال چل رہی ہے

تدبیر کو مات ہونہ جائے

خوشید کا نور گھٹ رہا ہے

ظلمت کو ثبات ہونہ جائے

آخر ۵ اگست کو جب ہندوستان آزاد ہوا۔ اور عوام

مرگ لشن بے خزاں لٹ گیا !! سکوں زہرا من و اماں لٹ گیا

جو تہذیب تھی سیکڑوں سال کی وہ گنجینہ شائیاں لٹ گیا

دلوں کی سیاہی کی آنکھیں چلی اسی میں وطن ناگہاں لٹ گیا

تباہی کا طوقاں ہے چاروں طرف ہر اک طفل و پیر و جوان لٹ گیا

ایسے فرقہ وارانہ فسادات آئے دن برپا ہوتے رہے۔ اور وجہ

نے مسلسل ان کے خلاف آواز اٹھائی "نظم" عالم آشوب میں

انہوں نے فرقہ پرستانہ عصیت پر کڑی تنقید کی ہے۔

مذہب و تہذیب کے فلسفے عنخام سے

شغل فریب عوام دیکھئے کب تک رہے

مضطرب انسان کو امن میسر نہیں

کار جہاں ناتمام دیکھئے کب تک رہے

۱۹۶۹ء میں احمد آباد کے فرقہ وارانہ قتلوں سے متاثر ہو کر

انہوں نے نظم "ماحول" لکھی ہے۔

امن و انصاف کا احسان جتانے والے

آج ہر گام پہ تو ہیں بشر ہوتی۔ ہے

نوشی و سرشاری میں جھونے لگے تو وحید نے نظم "آفتاب تازہ" لکھی جس کے نام ہی سے امید کی پہلی کرن پھوٹتی ہوئی نظر

آتی ہے۔ یہ نئے اور آزاد وطن کیلئے علامت ہے۔

آزاد و شاد و مست غزل خواں بنے زندگی

حسن حیات دیکھنے والا کدھر ہے آج

اک دن نواز خواب حقیقت میں ڈھل گیا

نخل امید اہل نظر بارور ہے آج

محسوس ہو رہا ہے انوکھا سا ہمانہ پن

اک سادہ جھونپڑا ہی سہی اپنا گھر ہے آج

آزادی کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، اس سے طرب

آزادی کا شمار سراب بن گیا۔ حالات نے عجیب کر ڈالی۔

اپنے ہی اپنوں کے دشمن بن گئے۔ قتل و غارت گری اور

خون آشامی کے جو واقعات رونما ہوئے، وحید نے بعنوان

"جہنا کی فریاد" ایک نظم تحریر کی۔ جو ان واقعات کی بخوبی عکاسی

کرتی ہے۔

کن مراحل سے گزرتے ہیں اسیرانِ ستم  
 رات زنداں میں تو مقتل میں سحر ہوتی ہے  
 روز ملتی ہے مہکتے ہوئے پھولوں کو سزا  
 روز گلشن کی زمین خوں سے تر ہوتی ہے  
 اسی طرح ۱۹۷۹ء میں جب بھیتو ٹڈی میں فسادات پھوٹے تو  
 وجہ سے برداشت نہ ہو سکا

شہر میں ظلم کے آثار ملے  
 آدمی نقشِ یہ دیوار ملے  
 کوئی آزاد نہیں شاد نہیں  
 سب مصیبت میں گرفتار ملے

وجہ کی نظر ہر چیز کی حسن و خوبی تک جلد پہنچتی ہے لیکن  
 جہاں تک زشت و قبیح کا تعلق ہے وہ اس سے پہلو ہتی  
 کرتے ہیں یہی وجہ تھی کہ وہ

ریگستانی خار دار پھول میں بھی حسن کے متلاشی ہیں۔ انہوں  
 نے "گوارہ مسیح" سفید گیٹس کے پھول سے متاثر ہو کر لکھی  
 ہے۔ ہیئت و لہجہ میں تو یہ نظم اقبال کے فلسفیانہ نظم "ساقی نامہ"



۱۷۷  
 ملتی جلتی ہے۔ اکثر ریگستانی پھول رات میں کھلتے ہیں۔ اور  
 راتوں میں کھلنے والے بیشتر پھولوں کا خاصہ ہے کہ وہ سفید  
 اور خوشبودار ہوتے ہیں۔ ایسے پھول رات کی ابتدائی حصے  
 میں کھلتے ہیں اور دو چار گھنٹوں کی شادابی کے بعد رات کی  
 تاریکیوں کے ساتھ ہی اپنا شباب کھو دیتے ہیں۔ شاعر نے  
 ان پھولوں کے رنگ اور انکی رات میں چلنے والی خصوصیت  
 کو پیش نظر رکھ کر اسکو شمع سے تشبیہ دی ہے۔ جو صبح کے  
 ہوتے ہوتے خاموش ہو جاتی ہے۔ دیکھئے۔

اے شب چراغ تجھ سے منور دل چمن

کھلنے سے تیرے دولت کون و مکاں ملی

پر کیف و دلنواز قبسم کا شکریہ

تری مہک سے میرے قلم کو زباں ملی

سفید ناگ پھنی (کیکٹس) کے پھول کی رعنائی و برنائی

کو ذہن میں رکھیے اور وحید کے ان اشعار کا مطالعہ کیجئے

شقاقت پانڈنی سے نبی ہے تری قیا

ضو بار نقوں میں تری کہکشاں ملی

تاروں کو رشک ہے ترے روئے صبح پر  
 تری جلو میں روح چمن نغمہ خواں ملے  
 آواز ہے شباب کے رنگین دور کا  
 تجھ کو حسین شب کی دلیں نوجوان ملی  
 اب دیکھیے ان حسین گھڑیوں کا کیف ابھی مٹنے بھی  
 نہ پایا تھا کہ اس کی رعنائی ویرنائی پر انحطاط کا سایہ  
 منڈلانے لگا اور شاعر کو اس حسین ارمغاں کے چھوٹنے  
 کا احساس ہوا اور بے ثباتی کا شکوہ کرتے لگا۔  
 لیکن ترا لباس عروسی کفن بھی ہے  
 مثلِ شباب کم تجھے عمر رواں ملے  
 یوں مسکرا کے چھوڑ نہ بزمِ طرب ابھی  
 اے ماہِ نو، جوان ہے لیلائے شب ابھی  
 اب غنچہ دہن مرجھاتے ہوئے فلسفہ فنا و بقا کو  
 اس طرح بیان کرتا ہے۔

دن رات ظُرفِ وقت میں ڈھلتی ہے زندگی  
 مٹی نہیں لباسِ بدلتی ہے زندگی

ان اشعار سے یہ نظریہ مترشح ہے کہ عالم آب و گل کے بعد عالم ارواح (برزخ) کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی کے لباس بدلنے والے اس فلسفے سے اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وحدتناسخ کے قائل تو نہیں ہیں ایسی بات نہیں وہ ٹھیک اسلامی نقطہ نظر کے قائل ہیں۔ جسد خاکی سے ہٹ کر روح کے لامتناہی سفر کے قائل ہیں۔ دیکھئے اپنے فلسفہ حیات کی وہ کس طرح توضیح کرتے ہیں۔

تعبیر جس کو موت سے کرتے ہیں بے خبر  
تبدیلی مقام ہے مرتا نہیں کوئی  
دریائے زندگی سے دما دم رواں دواں  
ڈوبے بغیر پار اترتا نہیں کوئی  
تصویر کائنات ابھی ناتمام ہے  
قدرت کو روز نقش بدلنے سے کام ہے

اس نظم کا لب و لہجہ طرز ادا، وحدت کو اقبال سے قریب دیتا ہے۔ خصوصاً ان کا آخری شعر اقبال کے ان اشعار کی

یہ کائنات ابھی ناشام ہے شاید  
 کہ آ رہی ہے دامِ صدائے کن فیکون  
 اور یہ شہرِ جہاں اقبال نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا ہے  
 ہے نقشِ اگر باطل تکرار سے کیا حاصل  
 کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ازرانی  
 و جد کی نظم "کاروانِ زندگی" و جد کی طویل ترین اور  
 مایہ ناز نظم ہے۔ اس میں انہوں نے کائنات کے آغاز و  
 ارتقاء سے لیکر انسان کے چاند پر جانے تک کے  
 واقعات کو بے اربیدوں میں بڑی ہی کامیابی سے نظم کیا ہے۔  
 اس طویل نظم کو انہوں نے تیس سال میں مکمل کیا ہے ممکنہ  
 حد تک سائنسی نقطہ نظر سے استفادہ کیا اور مذہبی تصانیف  
 قرآن شریف اور رگ وید سے بھی حوالے دیئے ہیں۔  
 "کاروانِ زندگی" میں و جد نے ابتدائے آفرینش  
 جس کو عدم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بڑی ہی خوبی سے  
 نظم کیا ہے۔ مصرعہ۔

ح فضا ئے بے فضا میں حرف کن کا انتظار ہے

اس حرف کن کو چاہے قرآنی نقطہ نظر نظریہ کن

فیکون سے تعبیر کریں یا نظریہ اضافت کے تحت ابتدائی  
خلل یا پھر پرو فیسر فرڈ ہائل (FRED HOYLE) اور ڈاکٹر

جے وی۔ نارلی کر (J.V. NARLIKAR) کے الفاظ میں بیڑا

دھماکہ۔ عدم و خلا کی تصویر کش کیلئے فضا ئے بے فضا

(space) کے معنی خیز الفاظ کا استعمال و جد کی علمیت

اور اہلیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ یکساں بکھرے الکٹران،  
پروٹان کے درمیانی قوت (قوت کشش و قوت مدافعت)

میں جب ابتدائی خلل پیدا ہوتا ہے تو سائنس کے بموجب

ان بکھرے جوہروں کا کاسمک میں اتحاد عمل میں آیا۔ جس کی

وجہ سے کئی سحابوں (NEBULAE) کا وجود عمل میں آیا۔

اس افراق فرمی میں ہر سحاب اندرونی قوت کشش اور بیرونی

قوت مدافعت میں اخراط پیدا ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے

میں ہر سحاب دوسرے سے پرے ہٹنے لگتا ہے۔ اور

مزید اتحاد عمل میں آتا ہے جس کے نتیجے میں ستاروں کی پیدائش

عمل میں آتی ہے ۔ ۷

جنوں میں موج برق کا جو رخ ذرا بدل گیا

غبار نور شعلہ بار پیکروں میں ڈھل گیا

خود ہی کی جیب ہوا چلی تو سب کا دل چل گیا

کوئی ادھر نکل گیا کوئی ادھر نکل گیا

ابھی چھڑا نہیں رباب داستان زندگی

عدم کی گرد میں نہاں ہے کارواں زندگی

بقولِ رضی الدین صدیقی :

ارتقا میں سحابوں کے بعد دوسرے نمبر پر

ستاروں کی پیدائش ہے ۔ پھر جوں جوں وقت

گزر رہا جاتا ہے ستاروں میں بھی مقامی انجماد

ہو کر مادہ علیحدہ ہو جاتا ہے ۔ ان کو ہم سیارے

کہتے ہیں اسی طرح بعد میں سیاروں سے چاند

نکلتے ہیں ۔ اور پھر سیاروں پر جہاں کہیں

دوسرے ارتقائی حالات موافق ہوں یعنی

ہوا پانی سمسرات وغیرہ مناسب شکلوں میں

پائی جائیں تو یکے بعد دیگرے اور بتدریج

جمادات نباتات حیوانات اور آخر انسان

مخردار ہوتے ہیں۔" اے

اب اس تمہید کے بعد دیکھئے وحید کیا کہتے ہیں ۷

انہیں میں تھی زمین بھی ایک شعلہء شررِ فشان

بجھی ہزار ہا برس میں مدتوں اٹھک دھواں

یہ رات جب کئی ٹوکوہ و دشت و جو ہوئے عیاں

دیا سمندروں کو آفتاب تپنے پہ پیامِ جاں

بنی اسی عمل سے سطحِ آبِ کانِ زندگی

عجیب شان سے رواں ہے کاروانِ زندگی

اور آگے لکھتے ہیں کہ "گذر گئے امید و بیم کے ہزار ہا برس"

اور پھر کہیں "رگ نبات میں رواں ہوا نفس" اور پھر زمین پہ

آبِ جاں فزا کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ ع۔

پیرتد سب لٹا رہے ہیں چمچوں میں خونِ دل

۷ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی "اضافیت" انجمن ترقی اردو

ہند۔ دہلی ۱۹۷۷ء پہلی اشاعت

اس تدریجی بناناں سے ہوئی ہوئی کہیں چل کر زندگی ایک مقام  
پہنچتی ہے

کھلی ہے مدتوں کے بعد اب زبان زندگی  
عدم کے بتکدرے میں دی گئی اذان زندگی

افراطِ زندگی سے جو مسائل پیدا ہو جاتے ہیں اس کے تدارک  
کے لئے بنی فطری طور پر جو کچھ آں کو وسعت دینے اپنی نظم میں  
پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے (struggle  
for existence) اور (use and Dis use)  
(SURVIVAL of the Fittest) کے نظریوں سے

بھی استفادہ کیا ہے

فضائے دہر میں نہال سرکشی نہ کھل سکا ابا،

جہاں سے مٹ گیا جو ظرفِ وقت میں نہ ڈھل سکا

اب کاروانِ زندگی اپنے مراحل سے گزرتی ہوئی منازل

کے پیچ و خم سے ہوتے ہوئے ایسے مقام پہنچتی ہے جسکو

تھیں ہے خوف کچھ بلند و پست و گرم و سرد کا

جیتیں شعرا آدمی بھی مرد ہے نبرد کا



پہنچ گیا پیام چاند کو زمیں کے درد کا

بلندِ حوصلہ ہے آج ہر خلا نور د کا

نئی فضا میں گامزن ہیں سرخوشاںِ زندگی

عجیب شان سے رواں ہے کارواںِ زندگی

لیکن اس معراج کو پہنچنے کیلئے کارواںِ زندگی کو کمی عوارِ ش

سے گزرنا پڑا۔ کتنے ہی تاج و تخت کی سرگرمیوں کو دیکھنا پڑا۔

کتنے ہی مصلحین کو سپہاگر نا پڑا۔ یہاں تک کہ جوہری قوت سے

بھی آگاہ ہونا پڑا ہے

خوشِ مادرے میں زور بے پناہ قید تھا

خرد نے اسکو جوہروں کے دامن سے ہٹا لیا

بشر نے سدا و شوق سے یہ رازِ خاص پایا

اب آرزو کی انتہا سے جوصلے کی انتہا

نیا جہاں بنا رہے ہیں واقفانِ زندگی

عجیب شان سے رواں ہے کارواںِ زندگی

اس طرح و جد نے کارواںِ زندگی کی داستانِ حقیقت

کو اشتعار کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ظا انصاری نے

اس نظم کو "اپنے دور کی اردو شاعری کا ایک اضافہ" قرار دیا ہے۔ لیکن رشید حسن خان کے خیال میں :

"یہ بجائے خود ایک اچھی نظم سہی لیکن یہ وحید کی نمائندہ نظم نہیں۔ بات یہ ہے کہ وحید جذبے کے شاعر ہیں اور یہ نظم اور ایسی دوسری نظموں دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں" اور پروفیسر مسعود حسین خان کے نزدیک :

"وحید بیانیہ شاعر نہیں اس لئے انہوں نے اس قدر طویل موضوع کیلئے مثنوی کی صنف کو اختیار نہیں کیا ان کی فکر تغزل کے پردے میں جلوہ گر ہے۔ اس طرح کہ مسدس کی ہیئت کو بھی انہوں نے غزل کا درجہ دے دیا ہے۔

اسی لئے اس نظم میں ایجاز و اختصار کی ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جس سے تشنگی

لے رشید حسن خان 'وحید کا شاعر، چنداں شار نے' وحید شاعر و شخص۔ مکتبہ جامعہ لکھنؤ نئی دہلی۔

کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ ۱

وسجد کی شخصیت اور شاعری میں ایک روحانی کیفیت  
کی فراوانی ہے۔ شعریت، نغمگی، سرمستی و سرشاری، گو یا  
ان کی سرشت میں تھی۔ الفاظ و ترکیب کے استعمال میں  
بھی وہ محتاط رہے۔ اگرچہ انہوں نے عشق و محبت کو قریب  
کہا اور نظم سچی باتیں میں لکھا ہے۔ ۲

وسجد کو معلوم ہے ماہیتِ حسن و عشق

ایک قریب خیال ایک قریب نظر

لیکن اس کے باوجود ان کے اشعار میں حسن و عشق کی  
وارداتیں ملتی ہیں۔ بقول مرزا ظفر الحسن:

”وسجد نے عشق کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کے ہر شعر

میں حسن رچا ہوا اور عشق گھلا ہوا ملتا تھا۔“ ۳

۱ مسعود حسین خاں ”وسجد شاعر و شخص“ مکتبہ جامعہ  
لیٹیٹر نیٹو دہلی۔

۲ مرزا ظفر الحسن ”ذکر یارِ حلے“ حسامی بکڈ پوچھلی کمان

حیدرآباد مارچ ۱۹۷۹

عشق و محبت کا جذبہ ان کی شاعری کی رگ رگ میں سرایت  
 کر گیا تھا۔ اور ان کا عشق روایتی عشق ہونے کے باوجود  
 خلوص اور قربانی و ایثار کا حامل تھا۔ لیکن وارفتگی و سپردگی  
 کا احساس ان کے ہاں پر پروانہ کی بہ نسبت شمع کی طرف  
 سے ملتا ہے۔ یہ رجحان ان کی شاعری کو ہندی شعروادب  
 سے قریب کرتا ہے۔

میرے آنے کی مسرت کو بھی سے نہ چھا  
 کونسی شمع نہیں منظر پروانہ

پھر حسن کا شہر جھومتا ہے

آواز پر و حب بے نوا کی

اسی طرح شباب و خواب کی دنیا میں بھی یہی نصیب

ملتا ہے۔

کبھی قبل سحر پورانہ ہوتا میرا قصانہ !

جھکولے نیند کی موجوں میں کھلتی جان سے نہانہ

خوشی سے شمع بستی زینت آغوش پروانہ

یونہی اکثر چمکتی رات بھر تقدیر غم خانہ

میں تھی ہم نشین میرے شباب و خواب کی دنیا

و جد کی پارکھ نظر ہر چہرے میں حسن ڈھونڈ لیتی تھی۔ چنانچہ

نظم ایک خط کا جواب "میں انہوں نے لکھا ہے۔ ۵

شعاع حسن کو ہر شے میں ڈھونڈ لیتا ہوں

مرے کلام سے روشن ہے میری خوش نظری

اور ساتھ ہی کسی شے کے سراپا کو بٹری وضاحت سے بیان

کرتے تھے۔ نظم "یاسمیں پیکر" میں پیکر حسن کو اس طرح بیان

کیا ہے۔ چہرہ گنگوں، مہکھری آنکھوں میں کیفِ شراب لالہ نام

مسکراتے ہیں لبوں پہ عکسِ دندانِ صنوبرِ گنگ، ہونٹ جیسے بارشِ بہار

گل کی پتی موڑ دے گویا ۵

ہر نفس سازِ تخیل کے لئے مضرب ہے

یاسمیں پیکر مجسمِ نغمہ بیستاب ہے

اب دیکھئے آمدِ بہار کا شعر۔

صبا صبا بدش آئی نہالانِ چین جھومے

نہیں چینِ چین نقشہ ہے کوئے مئے فروش کا

پرانے خط دیکھئے کتنے حسین ہیں۔

تختہ محل ہے پاک خاروں سے

گھر منور ہے ماہ یاروں سے

غسل شبنم سے پھول نکھرے ہیں

(پرانے خطوط) قرش پر یوں خطوط بکھرے ہیں

وحید کی منظومات میں ہر نرالی ادا، اور ہر انوکھا رجحان

مستور ہے، ہر قسم کا رنگ و روغن، ترنگ و آہنگ مل جاتا

ہے۔ حقائق زندگی، مناظر قدرت، اظہار فطرت، حسن و عشق

کی باتیں گل و بلبل کی حکایتیں۔ قصائد تاریخ و تمدن فنون لطیفہ

و مفید فنون غرض ہر چیز کی جلوہ گری ہے۔ وحید کی منظومات

طویل سے طویل تر بھی ہیں اور مختصر سے مختصر بھی۔ انہوں نے

ہر فارم اور ہر طرز اور ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیابی

بھی حاصل کی ہے۔ وحید کو الفاظ پر پوری گرفت تھی۔ وہ الفاظ

کے مزاج دان تھے۔ جیسے بھی چاہیں الفاظ کو شاعری کے سلیقے

میں ڈھال لیتے تھے۔ انہیں تخلیق فن کے دوران فن کے آداب

قوانین و ضوابط کا ہر دم خیال رہتا اور وہ انہیں بڑے ہی

سلیقہ سے برتتے تھے۔ انہوں نے روایتی شاعری کو اپناتے

ہوئے بھی اس میں جدت و ندرت کو جگہ دی اور شاعری  
 میں دوسرے فنون لطیفہ کے مزاج کو سمو دیا۔ الفاظ و خیال  
 کو تراش خراش کر اور بھی دلکش بنا دیا۔ مترنم الفاظ کو استعمال  
 کر کے اس کی غنائیت و موسیقیت میں بھی اضافہ کیا اور اسی  
 طرح ہر طرح اپنے خیال کو کچھ اس طرح نظم کیا ہے۔ کہ خیالی  
 پیکروں کا وجود ممکن ہو جاتا ہے۔ جو ان کے اشعار پڑھنے  
 کے بعد ہمارے ذہن پر دستک دیتے ہیں۔

# وید کی غزل

ترقی پسند ادبی تحریک کی وجہ سے اردو شاعری  
 نے اگرچہ ایک نیا اور واضح موڑ لیا تھا۔ لیکن حق تو یہ ہے  
 کہ اس سے کہیں پہلے حالی اور ان رفقاء کی کوششوں  
 سے اردو شاعری مغرب سے متاثر ہو چکی تھی اور جدید  
 عناصر سے مانوس ہو چکی تھی۔ بڑی بات تو یہ کہ اب نظم  
 نگاری کو فروغ ہو رہا تھا۔ اور ساتھ ہی غزل بھی نیا موڑ  
 لے رہی تھی۔ زندگی کا پیچ و خم کچھ ایسی صورت اختیار کر رہا تھا  
 کہ شاعری میں نظم کا پلہ بھاری ہونے لگا تھا۔ وہ شاعر جو  
 حالی کی اصلاحی کوششوں سے متاثر تھے نظم نگاری کی  
 طرف زیادہ مائل تھے۔ تاہم غزل کہنے والوں کی تعداد



بھی اپنی جگہ تھی۔ شعر و ادب میں حقیقت پسندی اور واقعات نگاری کے باوصف جمالیاتی اقدار سرخر و تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ غزل گو شعراء نے جمالیاتی اقدار کو زیادہ عزیز رکھا تھا۔ و سبہ اسی دور کے ان شعراء میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ جنہوں نے منظومات کے ساتھ غزلیات پر بھی کافی توجہ دی اور اس کے مخصوص رومانی کیفیات اور جمالیاتی احساسات کو بہر کیف عزیز رکھا۔ ان کی شعری تخلیقات میں سرور و کیف، نغمگی و سرشاری، حسن و عشق، نزاکت و نقاست، دلاؤ و نیری و گلکاری، کی آمیزش ہے۔ جس کے باعث وہ تخلیقات اپنی شناخت آپ بن جاتی ہیں۔

اورنگ آباد کے شعر پرور خصوصاً متغزل ماحول نے سکندر علی کو سبہ تخلص اختیار کرنے اور وجدان کی دنیا میں داخل ہونے کا شوق پیدا کر دیا۔ خود اپنے ایک مضمون "میں اور میرافن" میں رقمطراز ہیں :

میں نے اڑتالیس برس پہلے اورنگ آباد میں

غزل سے شاعری شروع کی تھی۔

۱۔ سکندر علی سبہ میں اور میرافن "ہفت روزہ بلتڑ" ۲۵ جولائی ۱۹۷۹ء

تغزل و ترنم کو اپنانے والے اس شاعر پر ابتدا میں  
 اسلاف کی مخصوص چھاپ نمایاں تھی۔ انہوں نے نظیر الکریادی  
 انیس اور اقبال کی منظومات کا رس بخوڑ لیا تھا۔ میر و سودا کے  
 عہد سے غالب و انیس تک کی ہر اہم آواز کی بازگشت سے متاثر  
 ہو چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کے ہاں ایک نئے اسلوب  
 کی اختراع عمل میں آرہی تھی۔ جس میں میر کی خودداری و  
 خود پسندی غالب و تفکر و تجسس حالی کی درد مندی و ہمدردی  
 انیس کا تقدس اقبال کی خودی و خود شناسی حقیقت کی رہنمائی  
 اور اختہ شیرانی کی شوقی و بے باکی کا ملا جلا عنصر پیدا ہو گیا  
 تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نے بہت جلد قبولیت عام  
 حاصل کر لیا۔ اور نگ آباد کے مشاعروں سے جامعہ عثمانیہ  
 کے حصاروں میں آنے کے بعد انہیں ایک نیا مزاج مل جاتا  
 ہے۔ اس وقت ہم عصروں میں غدوم نے اپنی سخن طرازی  
 کا باقاعدہ اعلان کر دیا تھا۔ میکش نے شعر و ادب کی ناز برداری  
 میں کما حقہ حصہ لے رکھا تھا۔ ابتدا ہی سے وسجد اور مخدوم  
 کے خیالات میں شتر گرگی پائی جاتی تھی۔ مخدوم نے تقاضائے

وقت کو پیش نظر رکھ کر رومانی شاعری کے ساتھ ساتھ انقلابی شاعری کی تاسیسات رکھی تھیں۔ وسجد نے اسلاف کے احترام کو اپنا فرض سمجھا۔ اس کے برخلاف محذوم نے ان سے انحراف کو ہی نصب العین جانا۔ روایت سے شدید بغاوت نے انہیں ترقی پسند تحریک سے وابستہ کر دیا۔ اور غزل کی روایتی ہیئت سے بیزار ی انہیں ابتدا میں صرف غزلوار لکھنے پر مائل کیا۔ وسجد نے اپنے مسلک کی مجملہ عثمانیہ ۱۹۳۶ء کے ادارہ میں وضاحت کی ہے۔

"جب تک دل میں شاندار ماضی کی یاد تازہ نہ ہو مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ اسلاف کے کارناموں کو اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے نہیں بلکہ اپنے جوش عمل کو دوبالا کرنے کیلئے یاد رکھنا چاہیے۔" لہ

لہذا وسجد نے غزل گوئی کی روایت کو ترک کرنے کے بجائے لہ سکندر علی وسجد "مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد ۱۹۳۶ء جلد نہم شمارہ ۱۱ اور ۱۲

اس کو جدتِ ادا و ندرتِ خیال کی گلکاریوں سے سجایا۔ اور

اس میں ایک نیا نکھار پیدا کر دیا۔ ۷

متلئے سخن کے جواہر سجاکر

نگاہِ خریدار سے کھیلتا ہوں

بقول شمس الرحمن فاروقی :

”و جد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں

ان کی غزل میں وہ کیفیت ملتی ہے جسے میں

استادانہ ٹھہسے، تعبیر کرتا ہوں“ ۷

اور آگے چل کر وجد کی شخصیت اور ان کی شاعری کے رکھ

کچھ اذکار و سلیقہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرما ہیں :

”سکندر علی وجد اپنے بہترین لمحات میں اس

وقت روایتی غزل کے بہترین اور صالح ترین

نمائندہ کہے جاسکتے ہیں۔ الفاظ محاورہ

و ترکیب کے استعمال میں وہ سارا رکھ رکھاؤ

۷ شمس الرحمن فاروقی ”فاروقی کے تبصرے“ شب خون

کتاب گھر، رانیٹ ٹریڈ، الہ آباد ۱۹۶۷ء

جو صرف پختہ کاری نہیں بلکہ ایک فطری اسلوب  
 کا آئینہ دار ہوتا ہے، وجد کے یہاں موجود ہے لہ  
 ظ انصاری نے بھی وجد کے اس رکھ رکھاؤ اور احتیاط کو  
 اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے :

” وجد نے اپنے شعر کو اندرونی شخصیت کی لہک  
 سے، تہ داری سے، اس کی وسعت، گہرائی اور  
 رنگینی سے محفوظ رکھنے کے سارے جتن کر لیے  
 تب چھاپے کی مشین سے گزرنے کا اہتمام  
 کیا۔“ لہ

ان کی ابتدائی غزلیات یا وجود ایک نئے اسلوب کو  
 اپنانے کے روایت کی فرسودہ چھاپ سے بگا نہیں سکیں۔  
 جس میں گل و بلبل کے نغمے بھی ہیں۔ اور عشق و محبت کے تراجم  
 لہ شمس الرحمن فاروقی ”فاروقی تبصرے“ شب خون  
 کتاب گھر رانی منڈی الہ آباد۔

لہ ظ انصاری ”کتاب شناسی“ بمبئی اگست  
 ۱۹۵۸ء پہلا ایڈیشن۔

صرف یہی وجہ کی کائنات کل نہیں۔ بلکہ انہوں نے حقائقِ زندگی اور اپنے تجربات و حوادثات کو بھی بڑی حد تک غزل میں سمونے کی کوشش کی، ماسوا اس کے وجہ کی ابتدائی خصوصاً "ہو ترنگ" کی غزلوں میں سطحیت اور کچھ اکھڑی اکھڑی ہی کیفیت ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے غزل نگاری کا حقیقی تفکر انہیں ابھی ہاتھ نہیں آیا، عبدالوحیدؒ نے جدید شعرا۔ نئے اردو میں لکھا ہے :

"غزلوں میں ایک پھیکا پن ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجہ صاحب غزلیں نظموں کی طرح ڈوب کر نہیں کہتے۔" ۱

ہو ترنگ میں بعض ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جو تیرے بھی پہلے کی معلوم ہوتی ہیں۔ جن میں روایتی انداز کا قدیم رنگِ روغن بکھرا ہوا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ۲

وصل میں وہ مزا کہاں تھا جو فراقِ پیار میں

حیف کئی تہِ زندگی کیوں ترے انتظار میں

۱۔ عبدالوحیدؒ "جدید شعرا نئے اردو" فیروز سنٹر پرنٹرس، کراچی

پہرے کے تھے رشتہ تقدیر سے  
کھل گئے اک جنبش تدبیر سے

رہے گا وجد بیان عشق کا سدا یکساں  
بدلتی جائے گی سرخی فقط فسانے کی

جب سے ٹھکرا دیا نشیمن کو

برق پر مسکرا رہا ہوں میں

دل کی بستی عجیب بستی ہے

یہ اجڑنے کے بعد بستی ہے

و جد کیا معلوم کیا بنتی وہ شے

جو شراب ناب بن کر رہ گئی

ابتدا میں وجد اقبال سے بڑی حد تک متاثر دکھائی

دیتے ہیں دوسرے شعرا کی بہ نسبت ان کی غزلوں میں اقبال

کا وہی رنگ نکھرا ہوا ملتا ہے جو بانگ درا کی غزلیات

میں پایا جاتا ہے۔ چھوٹی بڑی بحروں میں منتر ستم و مسلسل

تغزل سے بھر لو پر غزلیں وہی اپروں چاکھتی ہیں۔ اسکی وجہ

یہ بھی ہے کہ وجد خود کو اقبال کے پیروؤں میں شامل کرنا چاہتے

نظر حیدر آبادی نے اپنی تصنیف 'اقبال اور حیدر آباد' میں  
اس طرح تحریر فرمایا ہے:

"اقبال کی شاعری سے وہ (وجہ)، اس درجہ

متاثر رہے ہیں کہ اقبال کو اگر ان کو روحانی

مرشد کہا جائے تو مناسب ہوگا۔" لے

اسی تصنیف میں ایک اور جگہ بھی اس کی وضاحت کی ہے:

"اس دور کے شعراء میں فکر اقبال سے قربت

کی سعادت سب سے زیادہ سکندر علی وجہ

کو حاصل رہی۔ وجہ کی شاعری میں اقبال اسی

مرتبہ پر فائز ہیں جس مرتبہ پر پیرو می خود

اقبال کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔" لے

چند اشعار جو اقبال کی ترنگ میں رنگے ہوئے ہیں ملاحظہ

فرمائیں: لے

لے نظر حیدر آبادی "اقبال اور حیدر آباد" اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی ۱۹۷۱ء



عجب آرزو ہے الوکھی طلب ہے  
مجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں،

ترے سوال سے جہاں الفت کلام بھانا نہیں کسی  
تجھے یقین آئے یا نہ آئے یہ راز ہے میری خاموشی کا،

قلم ہستی ہے اصلی امتحان گاہِ کمال  
بحرِ طوفان کی ہر موج دریا دل نہیں

دل حقِ نیکِ حقِ نگرِ مل گیا  
عجب سالک باخبرِ مل گیا

تھوڑی سی خودی سے گر لے کام  
خودِ شمع پھرے اگر گردِ پرِ پرِ وا نہ

نگاہِ منتظرِ آفتابِ تازہ ہے

عروسِ صبح ستاروں کی سسگواری نہیں

زمانہ ہے کہ خوشست شو ہے ایک مدت سے

گلیمِ فقر سے بوئے جہاں بانی نہیں جاتی

لہوِ ترنگ کی غزلوں سے جو کیفیت مترشح ہے۔ اس سے

وہ سچ بھی کہا حقہ واقف ہیں۔ انہیں اس کا اعتراف بھی ہے۔

کس اس مجموعہ کے اشعار زیادہ تر حسن و عشق کی کہنہ شراب  
 سے لبریز ہیں۔ جو غر سودہ ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت  
 کو برقرار رکھتی ہیں۔ لہو ترنگ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔  
 صر خم غزل سے چھلکتی ہے حسن و عشق کی سٹے  
 وسجد کی شاعری کا عنوان ہی کچھ ایسے ماحول میں ہوتا

ہے جس کو رومانی ماحول کہا جاسکتا ہے۔ ایسا ماحول جہاں ایسی شاعری  
 پروان پڑھ رہی تھی جس میں عشق حقیقی کا رنگ بھی تھا اور عشق  
 مجازی کا آہنگ بھی۔ گویا رومانیت کی فراوانی تھی جو حقیقت  
 نگاری سے قدرے میل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن  
 اس غیر فطری تضادم سے کوئی خاصہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ یہی  
 وجہ ہے کہ وسجد کی شاعری میں حقیقت نگاری کا اتنا دخل نہیں  
 جتنا کہ رومانیت کا ہے۔

اک پر تو ڈککش ہے خیالوں کے اثر کا  
 خود حسن حقیقت نہیں دھوکہ ہے نظر کا

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وسجد کی شاعری صرف لفاظی یا  
 تلافیہ پیمائی ہے بلکہ ان کے بیشتر ابتدائی اشعار میں ان چیزوں کا

فقدان ساتھ۔ جس کا کہ ادب اور زمانے کو تقاضا تھا۔  
وہ جد نے بھی محسوس کیا تھا۔ خود انکے الفاظ میں:

” اس حقیقت کا بھی شدید احساس ہے کہ

یہ شاعری وقت کے حوصلوں و ضرورتوں

اور آرزوؤں کی پوری ترجمانی نہیں کرتی۔“

وہ جد نے اس کمی کو دور کرنے کی ممکنہ کوشش کی آفتاب

تازہ کے سپہر ادب پر طلوع ہوتے ہوتے ان کے اشعار

جو ابھی خلوت کدہ حسن و محبت میں گرفتار تھے۔ دھیرے دھیرے

وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے اور قرب و جوار کے حالات

کی طرف مائل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ آزادی کے نعرے

بھی وہ جد کے تنگ نائے غزل میں جگہ پانے لگے۔ وہ صنف

جو صرف پتنگ و ریاب کی محفلوں کے لئے مختص ہو چکی تھی۔

سیاسی و سماجی مسائل کو سلجھانے اور ان کے اظہار کیلئے

وہ جد کے ہاں پہلی بار مستعمل ہوئی چند شعر درج ہیں۔

” سکندر علی وہ جد“ اور ”مصور“ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر دہلی ۱۹۶۳ء

زندگی خون میں نہائی ہے  
لوگ سمجھ بہار آئی ہے

ہم صغیر و کہاں کی آزادی  
دام سے ناقص رہائی ہے

وجہ آزادی کے پودے کس لئے

خون سے بڑھ کر پسینہ چاہیے

ہو رہے ہیں صاف صدیوں کے کھنڈر

مدتوں ہماری رہے کی توڑ کچھو ٹڑا

فضا میں شور ہے یہم غوشی کے نعروں کا

ترپ کے رہ گئے فریاد، دادخواہ کہاں!

حالی کی مخالفت کے بعد غزل کو ایک اور گروہ سے

دست دیا ہونا پڑا۔ یہ ترقی پسند تحریک تھی۔ اس تحریک نے

ادب کو نہ صرف زندگی کی مادی حقیقتوں اور جدلیاتی واشتراکی

قدروں سے روشناس کرایا۔ بلکہ اس کو روبہ عمل لانے کی کوشش

کے بھی کی۔ ترقی پسند غزل کی بوتلموئی طبع سے اچھی طرح واقف

نہیں تھے۔ لہذا غزل کی مخصوص وضع قطع کو مد نظر رکھ کر اس صنف

احترار و اجتناب کرتے رہے۔ لیکن غزل کی اوج قسمت تو  
بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اور یہیں سے اس کی قسمت میں  
تابندگی پیدا ہوئی ہے۔ آزادگی ہند کے بعد جو نون پکان جادئے  
رو نما ہوئے اور عفریت تعصب کے ظلم و استبداد و سیاسی  
انتقام کا وہ بازار گرم ہوا کہ انسان تو انسان حیوان بھی شرمناک  
و سجد جیسا غزل گو شاعر جب ان ناقابل برداشت حالات  
کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے اشعار میں اشارۃً ہی کیوں نہ ہی  
اس کا تذکرہ آجاتا ہے۔ اب ترقی پسند مصنفین کے آگے یہ  
عقدہ کھلا کہ غزل ایک ہمہ جہت صنف ہے جس کو کسی ایک  
جہت کیلئے مختص نہیں کیا جاسکتا۔ تو اب بیشتر ترقی پسند شعراء  
بھی غزل کی وسعت و ہمہ گیری کے قائل ہوئے، اور نہ صرف  
غزل گوئی پر مائل ہوئے بلکہ اچھی غزلیں بھی کہیں ان شعراء  
کی تقلید میں عمومی غزل گو شعراء نے بھی واقعات حیات و کائنات  
کو ظرف غزل میں سمونا شروع کیا یہاں سے جدید غزل کی پیدائش  
ہوتی ہے۔ سجد کو بھی اب حقیقت نگاری کی سمت مائل ہوتا  
پڑا اس کا اظہار بھی وہ غزل کی زبان میں کرتے ہیں۔

رخ زندگی سے نقابیں الٹ کر  
حقیقت دکھانے کو جی چاہتا ہے

بہلتی نہیں داستانوں سے دنیا  
یہاں اب حقیقت نگاروں کے دن ہیں  
وسجد کی سرکاری و نیم سرکاری مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ  
وہ اور شعراء کی طرح ہمہ وقت شعر نہیں کہہ سکتے تھے اس  
کا انھیں احساس بھی تھا اور اعتراف بھی۔ اوراقِ مکتوب  
کے دیباچہ میں اپنی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں۔  
”یہ نہایت پابند اور مصروف زندگی کی پیداوار ہے۔“  
تاہم انہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر شاعری اور بالخصوص  
غزل کا ساتھ دیا۔ ۷

رباعمر بھر و تجد رسیا غزل کا  
محبت کے نغمے کو پائے زندگی ہے

غزل کو وہ ہر دلچیز صنف کہتے ہیں۔ اور اپنے اشعار میں  
جہاں تنہاں اس سے والہانہ گلاؤں کا اظہار بھی کیا ہے۔ اور  
بڑے سلو نے اور بڑے ہی دلکش انداز میں یہ شعر ہے  
لے سکندر علی و تجد اوراقِ مکتوب ”مکتبہ جامعہ ٹیڈ دہلی ۱۹۶۲ء پہلی اشاعت۔“

وسجد اردو کی آبرو ہے غزل

یہ نوازش ترے وطن کی ہے

انہوں نے غزل کی ہمہ جہت خصوصیت کا کما حقہ لحاظ رکھا اور اس کے دامن میں متنوع موضوعات کو جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ۵

وہی دراصل غزل ہے جس میں

تیغ و پازیب کی جھنکار ملے

شاعری کو وہ جذبہ تخلیق کی روشنائی کا دریچہ سمجھتے تھے۔ لیکن وغزل نشاط و ابتنساط کے لئے کہتے تھے۔ چنانچہ اوراق مصور کے دیباچہ میں تحریر فرما ہیں:

”میرے لئے شاعری جذبہ تخلیق و اظہار کی

تسکین کا سامان ہے“ ۱۷

آگے میں اور میرافن میں رقمطراز ہیں:

”میں غزل اپنے شوق اور نشاطِ خاطر کیلئے کرتا ہوں“۔ ۱۸

۱۷ سکندر علی وسجد اوراق مصور ”مکتبہ جامعہ سید جامعہ نگر دہلی“

۱۸ ”میں اور میرافن“ ہفتہ روزہ بلٹنر کبڑی ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء

وجد نے غزل کو سدا بہار صنفِ سخن کہا ہے۔ جو ہر وقت ہر ماحول  
 اور ہر معاشرے میں حیات و کائنات کا ساتھ دیتی ہے ہر طرف  
 میں ڈھلتی اور ہر رنگ سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ہر قسم کے  
 فکر و فن کو آغوش میں لیتی ہے۔ ان کے چند اشعار جو خود  
 ان کے مسلک کے نمائندہ اور تغزل کی چاشنی میں لبریز  
 ہیں درج ہیں۔

آتش کدہ دل سے رواں موجِ سخن ہے  
 ہر شعر شرارہ ہے مرے خونِ جگر کا

جس طرح موجِ صبارا ہر نکہت گل  
 و جہ نسبت ہے یہی شعر کو الہام کے ساتھ

جب سے حرفِ وفادل پہ نازل ہوا  
 شاعری زندگی کی زباں بن گئی

تخیل کو کلمہ دینے والے  
 غزل عکس رخ جاناں تہ ہو جھلے

فکر کی آگ میں بنتا ہے سخن  
 حرفِ پیر سوز دعا ہو جلیے



پر غزل میں یہی محسوس ہوا  
میں نے کچھ ان سے کہا ہو جیسے

شمال ہے غزل کی تازگی میں

خوبی ترے لعل بے بہا کی

وہجہ کی غزلوں میں سادگی اور پیکاری دونوں خصوصیات

پائی جاتی ہیں۔ سادگی بھی ایسی کہ جس پر ہزار تکلف نثار ہو جائے

ابہام و ابلاغ کے مسائل گویا یہیں ہی نہیں، دھیمے سروں،

مترنم بحروں اور سیدھی سادھی عام فہم زبان میں تخیلات کو

متغزل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشعار اکثر سہل و مستمع کے

زمرے میں آتے ہیں۔ بقول پروفیسر رفیعہ سلطانہ ان کی غزل:

”تخیل کے ذریعہ امکانات کی از سر نو تعمیر

کرتی اور داخلی طور پر انسان کو بدلتے میں مدد

دیتی ہے۔“ ۱۷

ڈاکٹر منحنی تبسم کا خیال ہے۔

”وہجہ نے جہاں ایلو، اجلتا تاج محل جیسے

۱۹۶۱ء

۱۷ رفیعہ سلطانہ ”فن اور فنکار“ مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد، لاہور

منظاہر حسن پر خوبصورت نظریں لکھیں ہیں  
وہاں اپنی غزلوں میں داخلے احساس اور  
ماورائی کیفیات کو ٹھوس پیکروں میں ڈھال  
دیا ہے۔“ لے

یہ ٹھوس پیکر ان کے تخیل کی تخلیقات ہونے کے علاوہ حیات  
کائنات کے اثر و رسوخ سے متاثر ضرور ہیں۔ اسی لئے ہمیں  
یہ پیکر مانوس لگتے ہیں۔ سادگی و سپہ کاری نے رنگ غزل  
کو اس قدر سلجھا دیا ہے کہ شعر غور از زبان زد ہو جاتے ہیں۔  
الفاظ کا الٹ پھیر اس خوبی سے کیا ہے کہ شیرینی و شگفتگی  
دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کے  
تصورات الفاظ سے جھانک رہے ہوں۔ چونکہ وہ جدو  
ربان بیان اور فن پر غیب معمولی قابو حاصل ہے۔ اس لئے ان کی  
شاعری میں روکھاپن نظر نہیں آتا۔ فصاحت کا اندازہ ان کے  
ہر شعر سے کیا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں الفاظ تکیوں کی  
طرح جبرے ہوئے ہیں۔ خواہ موضوع کیسا بھی کیوں نہ ہو۔

لے ڈاکٹر مفتی تبسم اپنی بات ”سب سرام نامہ حیدر آباد لومبرک سمیر ۱۹۷۹ء“

شعر کو روانی سلاست سے خوب نکھارا ہے۔ یہی شاعر سحر  
ساحری بن جاتی ہے۔ ۵

جانے والے کبھی نہیں آتے جانے والوں کی یاد آتی ہے

میں ہی بے بس نہیں دل کے ہاتھوں تو بھی مجبور نظر آتا ہے

اپنا بلبلے دنیہ کو لیکن جیسی ہے دنیا ویسا نہ بن جا

راز حقیقت کون بتائے کھو جاتا ہے پانے والا

موت کتنی ہی شاندار سہی زندگی کا مگر جواب نہیں

سخت حالات کے اندھیرے میں وقت سے زور آزمائی ہے

اس سے قطع نظر و جد نے جہاں فارسی ترکیب استعمال

کئے ہیں ان کے ہاں ٹھوڑی اہلیت کا احساس ہوتا ہے۔

شاذ تمکنت نے و جد کے ہاں فارسی ترکیب کے بارے میں

لکھا ہے :

”و جد ایک طرف فارسی ترکیب کے دلدادہ

ہیں تو دوسری طرف سہل تمتع کی طرف راغب ہیں۔“ ۱۷

۱۷ شاذ تمکنت ”بیاض مریم تنقید و تبصرہ“ روز نامہ سیاست

یہ درست ہے کہ فارسی مترکیب نے ان کے اشعار میں  
خوشنمائی، حرور پیدا کی ہے لیکن بعض اشعار میں  
اضافت کے استعمال نے شعر کی روانی کو متاثر کرتے ہوئے

ایک شہراؤ سا پیدا کر دیا ہے۔

غبارِ رند ہے یا خاکِ ساقی، مہوش

ادب سے چوم کے ہر ساغرِ سفاک کو دیکھ

گدائے حسن ترا، غمگین سوال نہیں

گاہِ شوق میں، غمگین سوال کو دیکھ

اسی قبیل کا ایک اور مصرعہ نظر

کس قدر زور ہے یہ نشہ صہبائے بہار

وجد کی غزل میں رومانیت اور کلاسیکیت کا ایک حسین

انتزاع ملتا ہے۔ رومانیت دراصل کلاسیکیت اور اس کے

بندھے ہوئے قواعد و ضوابط کے خلاف بغاوت کی شکل میں

رہنما ہوئی، لیکن یہ جہت ہے ان دو متضاد چیزوں کو یکجا

کر کے بڑی رنگینی پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے کلاسیکی اسلوب

کو اپنایا اور پھر اس کو رومانیت کے ساتھ خوش اسلوبی سے

ہم آہنگ کر دیا۔" اوراق مصور کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"میں نے اظہار خیال کیلئے کلاسیکی

اسلوب منتخب کیا ہے۔" ۱

لہذا ان کے یہاں کلاسیکی طرز تحریر میں رومانی اشعار بڑی  
نویں سے اچھے سے معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری  
نے لکھا ہے :

"انکی غزل میں رومانیت کے ساتھ

حقیقت نگاری کا پیر تو بھی موجود ہے۔" ۲

ان کے تقریباً ہر عہد کی غزل رومانیت کی لذت پر چاشنی سے  
معمور ہے۔ جس میں حسن و عشق کے علاوہ فطرت کی عکاسی  
بھی ملتی ہے۔ ان کی غزلیات میں جہاں کلاسیکیت کا رنگ  
کچھ گہرا ہے وہاں ہمیشہ منطومات رومانیت کے آئینہ دار ہیں  
بقول ڈاکٹر سلیمان اظہر جاوید :

۱۔ سکندر علی وحید "اوراق مصور" مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۶۲ء  
۲۔ پروفیسر عبدالقادر سروری "اردو کی ادبی تاریخ" شیخ محمد عثمان اینڈ  
سنس، جولائی ۱۹۷۷ء دوسرا ایڈیشن۔

”کلاسیکی شاعری انفرادی جذبات و  
 احساسات کو رد کرتی ہے جبکہ رومانی  
 شاعری میں انفرادیت ہی سب کچھ ہے  
 بلکہ رومانیت کا دوسرا نام انفرادیت ہے۔“  
 وسجد کے ہاں چونکہ دونوں کی آمیزش ہے۔ اس لئے  
 ان کی غزلیات میں انفرادی تجربات بھی ہیں اور اجتماعی  
 کو اُلف کائنات بھی۔ ان کا رومانی شعور کلاسیکیت کے جلو  
 میں پروان چڑھتا ہے۔ ان کی شاعری میں فطرت کی عکاسی جا بجا  
 یوں ملتی ہے کہ انہیں شاعر فطرت سے موسوم کیا جاسکتا،  
 خود انہوں نے کہا ہے نہ

اکثر شب مہتاب میں اوہ شاعر فطرت

سہر گرم سخن بزم سخنراں میں ملے گا

اور اب ان اشعار کو دیکھئے

ہنسکراتے ہیں پھول کانٹوں میں

ہاتھ کیا طرز دلربائی ہے

۱۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ”تفقد شعر“ نیشنل بکڈپو چارکانا حمید آباد ۱۹۷۹ء

جن کی آنکھوں میں تھا الم و غزل  
ان غزلوں کی یاد آتی ہے

کہیں موسم بہاراں کہیں زندگی غزل خواں  
ترے حسن کی بدولت مرے شعر کے اثر سے

اس تکلف سے کھلا غنچہ دل

غنچہ بند قبا ہو جیسے

وہ چہرہ منور وہ آنکھیں شہزادی

شب ماہ میں پھول جیسے کنول کے

دکشی رنگ سیرن کی ہے

گل میں خوشبو ترے بدن کی ہے

وہ درجائت پسند ہیں۔ ان کا مسلک اپنے قدر دانوں کو

شریک عیش کرتا ہے۔ وہ خود جینا اور قارئین کو جینے کے مواقع

فراہم کرنا چاہتے تھے۔ تیر کی سادگی کو تو وہ سب سے زیادہ عزیز اپنایا لیکن

ان کے ہاں "ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے" جیسے قنوطی

طرز نگارشات کا فقدان ہے۔ غم و اندوہ کے پہاڑ بھی کیوں نہ

ٹوئیں رجا، انھیں رونے سے باز رکھتی ہے۔ غم کو خوشیوں کا

پیش خیمہ سمجھتے ہیں اور نشاطِ غم و سرورِ الم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے بازارِ جہاں میں خوشیوں کی ارزانی کو مد نظر رکھ کر غم کو گنج گراں بہا ثابت کیا تھا۔ نخی و زندگی میں وسعہ کو کسی قسم کی الجھن نہیں تھی خوشیوں کی بیکراں وسعتیں ملیں لیکن ریست و زمانے کے مطالعے سے انہیں غم و اندوہ کی اصل قیمت معلوم ہوئی مگر یہ غم نشاط اور ہے۔ لذت بخش، و جہد سرشاری ہے اور سب کچھ۔ ۷

اس غم کی فضا میں لغز زن ہوں  
جس غم نے مجھے خوشی عطا کی

اسی لطف سے و جہد سرشار ہے دل  
خوشی دینے والے نے غم دے دیا ہے

خوشی ارزاں ہے بازارِ جہاں میں  
بہائے غم متاعِ جان و تن ہے

تصوف اور فلسفہ دو ایسی چیزیں ہیں جو ابتداء ہی سے غزل کے لئے لازم سی ہو گئی ہیں۔ لیکن دورِ جدید کے شعراء نے بڑی حد تک ان چیزوں سے اپنا دامن چھڑایا ہے۔ و جہد نے



اپنے چند ایک اشعار میں فلسفے کی چاشنی بھر دی ہے وہ فلسفی تو نہیں لیکن انہوں نے شاعر ہونے کے ناطے بڑی حد تک حکمت اور فلسفے کو پیکر سخن میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے ان کی ابتدائی مسخروں میں ایک حد تک روایت پرستی کے آئینہ دار سہی ان میں پائے جانے والے جو بیش بہا مولیٰ ہیں ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ان کی کوتاہ بینی تو نہیں بلکہ ماحول کی تاثیر ہے اگر فضا میں بادِ غم کہیں کی سہی کیفیت ہو تو کیا عجب ہے کہ اشعار سے وہ رنگ چھلکتے لگے کیونکہ

ع      فضا آئینہ دار فکر و فن ہے

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے الفاظ میں :

”غزل روایتی روش سے بہت کم بھی اپنا وجود

تھام رکھ سکتی ہے۔ اس کے اندر حکیمانہ مضامین

کی تلاش بھی ممکن ہے۔ جو خود روایات کو اپنانے

اعتراف بھی کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے احساس

جمال سے زیادہ ہم آہنگ ہیں لیکن وجد کی غزلوں

سے حکیمانہ مضامین کی تلاش فصول ہے۔“

۱۔ صفی الدین صدیقی ”شخصیت اور فن سکندر علی وجہ“ روزنامہ سیاست، ۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء

مگر صفی الدین صدیقی کے اس قول کے باوجود وہ  
 کی غزلیں لفاظی یا قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی کی دلیل  
 ہیں۔ چنانچہ غزلوں میں فلسفے کے پیچیدہ و مشکل مسائل کو  
 و سجدہ نے سادہ اور سلیس زبان میں جس خوبی سے پیش

کیا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔ اگر ان کے شاعرانہ مزاج میں  
 فلسفیانہ تفکر و تصوفانہ جذبات کی فراوانی نہیں تو کم از کم عمیق  
 اخلاقی قدریں سلیق آموز و سلیق آمیز مسائل ضرور پائے جاتے ہیں  
 ایک ہی ذات ہے موجود زماں ہے نہ مکاں  
 دیکھنے کو یہ طلسم نہ و سال اچھا ہے

ساحل کی تلاش ناخدا کو  
 طوفاں کو تلاش ناخدا کی

کل تک جیسے تیری جستجو تھی  
 آج اس کو خود اپنی جستجو ہے

جہاں حد ہے احساس ادا گہی کا  
 وہاں تک خودی ہے وہاں سے خدا

مسائل رواں وقت کا قافلہ ہے

کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے

علم نے یوں تو بہت عقدہ مشکل کھولے

راگنچید فطرت کے نہاں اور بھی ہیں

وہجد کی غزل میں سرمستی و سرشاری، حسن و لطافت، شباب

شراب کی کیفیت، رنگینی و دلکشی، جذبات و صفائی، شگفتگی

تازگی، طرب و نشاطیہ کوائف غرض ہر خوشنما عنصر کی آمیزش

ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان بھی اسی خیال کے حامل ہیں

کہ وہجد:

” تغزل کے فن کار ہیں اور ان کا فن لفظوں کی

مینا کاری سے آگے نہیں بڑھ سکا وہ شعریت کا

دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اس لئے کہ تخلیق

شعر میں سپاٹ ہونے سے بہت جھجکتے ہیں۔“ ۱۷

وہجد کی غزلوں میں بادۂ کہنہ کا مزہ بھی ہے اور حال

کا دل گداختہ پن بھی۔ انہوں نے بڑی مشاطگی سے غزل کے

۱۷ مسعود حسین خان، ”وہجد شاعر و شخص“ مکتبہ جامعہ لٹریچر ڈیپارٹمنٹ، دہلی ۱۹۷۱ء

گیسو ستوارے ہیں۔ اشعار میں کیف و اثر کی ملی جلی پچا شستی  
 بھی ہے اور وارفتگی و سپردگی بھی۔ ان کے کلام میں زندگی کے  
 وسیع و وسیع حقائق بھی ہیں۔ اور پیش پا افتاد کوائف بھی  
 ایسا لگتا ہے جیسے اردو زبان میں بادۂ حافظ کا مزہ دیتے ہیں  
 جیسا کہ عصمت جاوید کہتے ہیں:

”ان کے کلام میں احساس کی دیوی دلی اودی آغ  
 کے ساتھ تخیال کی نفاست الفطوں کی شناسائی  
 اور لہجے کی شگفتگی ملتی ہے۔ ان کا لہجہ جمجوعی  
 طور پر لاشعری ہے سچ تو یہ ہے کہ ان کا کلام  
 حافظ شمس ازہی کی یاد دلاتا ہے۔“

وہ تھے بادۂ حافظ کی دوکان کھولی ہے

عزیز العجزہ حسن بیاں ہے اے دوست

اب دیکھئے وہ تھے کس طرح اپنے مطمح نظر کی وضاحت کی ہے

شعر کے پردے میں راز زندگی فاش ہوا

صرف لفظی شاعری کا دجید میں قائل نہیں

عصمت جاوید ”وجد شاعر و شخص“ مکتبہ جامعہ لٹریچر نیو دہلی

سیج تو یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں وہ کیفیت ہے جو

بقول خواجہ احمد فاروقی میر کے کلام میں پائی جاتی ہے تزئین

کلام کیلئے و تہجد نے صنائع لفظی کی یہ نسبت صنائع معنوی

سے کام لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ صنائع کے کے استعمال کے گز

سے بخوبی واقف ہیں۔ لہذا فصاحت کے شرائط و بلاغت کے

لوازمات میں کہیں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ اب دیکھئے حسنِ تعلیل

کی صنعت کس سلیقہ سے مستعمل ہے یہ

۵ صبا نے دیر تک چوما ہے شاید

بچھن میں عارض گل پر نمی ہے

۵ خندہ زن صورت گل دامن صد چاک مرا

پرچم فصل بہاری ہے تجھے کیا معلوم

۵ فیضِ عزم آشنا نگاہوں کا

سر خوشی بادہ کہیں کی ہے

شاعر نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کس طرح استفسار کیا، ملاحظہ ہو

نشانِ شمع محفل ہے نہ خاکِ اہل محفل ہے

سحر اب پوچھتی ہے رات پروانوں پہ کیا گزری

صنعت تضاد کے استعمال کو دیکھئے

تکلم کا جوہر عیاں کر دیا

نموشی نے جادو بیاں کر دیا

نگاہ اہل گلشن کہہ رہی ہے

خزاں جلئے بہار آئے نہ آئے

یوں تجھے یاد کیا کرتا ہوں

تو مجھے بھول گیا ہو جیسے

صنعت لف و نشر کی مثالیں ملاحظہ ہوں ۛ

تمیز خواب و حقیقت ہے شرط بیداری

نخیال عظمت ماضی کو چھوڑ حال کو دیکھ

نگاہ وقت میں تفریق ۵۵ سال نہیں

سراب گردش شام و سحر ہے کیا کہئے

صنعت مراعات النظر کی مثالیں بھی دیکھئے ۛ

ہجوم جلوہ بزم ادائے خود بینی

نگاہ صبر سے آرائشِ حال کو دیکھ

ہواؤں میں پیام برہمی ہے  
گھٹاؤں کا سنجہ نیستہ ماتمی ہے

آگہی اپنی خطا ہو جیسے  
بے بسی اس کی سزا ہو جیسے

اب دیکھئے ان کا طرز تعجب ہے  
غلامی کی میعاد کم کرنے والو!  
بڑھادی غلامی کی میعاد کسی

فشائے راز میں کتنی نجیل ہے فطرت  
حقیقت ایک بھی در سے کی آشکار نہیں

ان کے بیشتر غزلیں ان تمام التزامات سے معذور ہیں  
جو کلاسیکی شعراء کے کلام میں پچی بسی ہوئی ہیں جیسے گل و بلبل  
قفس و آشیاں برق و باران، بھنور و کشتی، ساحل طووز  
گلچیں و صیاد، دیرو حرم، کعبہ و بیت خانہ، مٹے و ٹیکہ،  
شاہد و ساقی، قیس و فریاد، ہجر و وصال، محل و لیلا کاہلوں  
قافلہ، منزل و جادہ وغیرہ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار  
ملاحظہ ہوں :

چمن میں گر میری لئے میں بلبلیاں کرے در داغے جی کا  
 گلوں کے دامن ہوں پندرے پندرے تو خون ہو دل کلی کلی کا  
 قفس میں نشیمن کی خاطر نہ تڑپیں

یہ بے بس اسیروں کی بے داد کلیسی  
 جب سے ٹھکرا دیا نشیمن کو  
 برق پر مسکرا رہا ہوں میں

عاشقاں ہجر برا ہے نہ وصال اچھا ہے  
 حسن جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

فصل گل جوش جنوں حسرت پرواز چر

مرغ پابند قفس ہے پرو بال اچھا ہے

ساحل سے موج روٹھ کر واپس چلی گئی

دیوانہ وار دولت طوفان لئے ہوئے

محبت ہی جادہ محبت ہی منزل

یہی ابتدا ہے یہی انتہا ہے



میں تو مٹے خوار ہوں ساقی تو کیوں

نشے میں پھر نظر آتا ہے

کئی مرتبہ دل پہ بجلی گری ہے  
مگر مسکرانے کو جی چاہتا ہے

طوفان کی خبر دینے والے اندازہ طوفان بکھر سکے  
کشتی کی تڑپ تھی پیش نظر موجوں کا نظارہ کیا کرتے

کوئی دیرو حرم کے درمیاں آواز دیتا ہے  
خدا کی آزمائش ہے صتم کی آزمائش ہے

جن شعراء نے غزل کو نوات کے حصار سے نکال کر

کائنات کے تشیب و فراز سے روشناس کرایا ان میں و جہد

کی بھی بڑی اہمیت ہے و جہد نے جو کہا ہے

کوئی مسکراتا ہوا جا رہا ہے

زمانے کی رفتار کا رخ بدل کے

اب غزل زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگی جس کی

بدولت شاعری غور و فکر کی اور زیادہ حامل ہو گئی۔ فرد بھی

ماضی کے مقابلے میں اب نسبتاً زیادہ غور و فکر سے کام لیتا ہے

حسن و قبح کی اصلیت کو پہنچانے کیلئے فرد کو دنیاوی  
حرکات و سکنت کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کام میں  
اس کا اہم کام بڑی اہمیت رکھتا ہے اسلئے اب وہ لغو باتوں  
سے محترز ہو گیا۔

زمانے کو فرصت نہیں گفت گو کی با  
عروس سخن پر است دروں کے دن ہیں  
اور جب اتنی لگن کے بعد اس کو پتہ چلا کہ دنیا کا دستور ہی ایسا  
ہے کہ یہاں ہر روز و شب ہنگامے ہوتے رہیں گے۔  
دم بدم رنگ بدلتا ہے جہاں  
ہر قدم پر زندگی کا ایک موڑ  
اور یہاں رگ ستے نشیب و فراز کے علاوہ خارزار بھی ہیں۔  
رہ حیات سراسر بھری ہے کانٹوں سے  
قدم قدم پہ مصیبت ہے آدمی کیلئے  
آئے دن رونا ہونے والے حوادث و مسائل پر غلبہ  
پانے کیلئے انسان کو اور بھی سوچھ بوجھ سے کام لینا پڑتا۔  
اب شاعر اپنی پچھلی زندگی کی فرسودہ حکایات کو یاد کرتے ہوئے

کہیں فکر دنیا کہیں فکر عقبین

کہاں آگے مسکدے بنے کلل کر

اگرچہ تلخ است شورشیریں دارد، کے مصداق انسان

کا یہ تفکر رائیگاں نہیں ہوا بلکہ اسکو آسمانوں پر لے اڑا۔

آدمی کو کہاں لے چلی ہے

تو سن فکر کی برق پائی

وہ جد نے آگے چل کر یہ بھی کہا ۔ ۵

کوئی غور شدید جہاں تاب سے اتنا کہہ دے

بزم ہستی میں کمی مشعلہ بجان اور بھی ہیں

وجد کی اپنی شاعری کا مقصد، نہ کوئی سیاسی انقلاب

ہے نہ سماجی اصلاح۔ لیکن چونکہ ان کا ادبی مسلک

’فن برائے فن‘ بھی نہیں۔ ان کی اکثر غزلوں میں ’ادب برائے

زندگی‘ کا وہی پاکیزہ تصور ملتا ہے۔ جو آزادی کے بعد جدید تر

غزلوں میں رونما ہو چکا تھا۔ بڑی ریاضت کے بعد

اب غزل کو ارضیت نصیب ہوئی تھی۔ وہ غزل جو گل و بلبل کے

استعاروں سے انسان کے دلی کوائف کی ترجمانی کرتی رہی  
اب عام فہم مانوس الفاظ میں ادا کرنے لگی۔ رمز و ایسا کا جو  
چلمن پڑا تھا۔ اس کو نئے انداز سے مزین کیا گیا پیرانی اور  
نئی تشبیہات، واستعارات، تلمیحات اور محاسنات کے  
درمیان جو خلیج بنی ہوئی تھی اسکو بڑی حد تک دور کیا گیا  
اب واقعات بڑے ہی سلیقہ و سادگی سے پیش کئے  
جائے گئے۔ الفاظ کی درو بست کو حسین اور خوشگوار انداز میں  
استعمال کیا جانے لگا۔ پیرانے تلازموں کی جگہ روزمرہ کے  
کے الفاظ اور طے تلازمے مستعمل ہونے لگے۔ دن،  
رات، اندھیرا، اجالا، سورج، چاند، شام، سناٹا،  
تنہائی، چرخ، ہوا، دھوپ، آواز، گھبراہٹ، درجہ،  
کمرہ، دروازہ، دستک، سڑک، راستہ، دھند، دھواں،  
چہرہ، سایہ، پرچھائیں، درخت، پتہ، شہنسی، قصب،  
حصار، سمندر، یادیاں، جزیرہ، ابر، پتھر، خاک  
ریت، راکھ وغیرہ جیسے الفاظ غزل میں نئی معنویت  
اور بلاغ کے ساتھ مستعمل ہونے لگے۔ وعید کے بار بھی

اپنے اشعار کی کمی نہیں۔ جن میں جدید غزل کی پرچھائیاں  
ملتی ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں۔

”ان کے موضوع، ان کی تشبیہیں، اور

استعارے ان کی شاعری کو ایک نیا

آہنگ بخشاتے ہیں۔“

اس ضمن میں ان کے چند اشعار پیش ہیں۔

شب چل و ظلمت ہوئی ختم آخر

اجالے میں تھرا رہے ہیں دھندلے

پھر حسن کا شہر جھومتا ہے

آواز پر وجد بے نوا کی

چمک رہا ہے بڑی شان سے نیا سورج

کئی مقام تر سے ہیں روشنی کیلئے

مبارک تجھ کو اے سروخرا ماں

جوانی دھوپ جیسے دوپہر کی

وجد عالم تھا عجب حسن کی حیرانی کا!

میں نے دستک جو نہ دی پردہ محل کے قریب

پروفیسر عبدالقادر سروری ”اردو کی ادبی تاریخ“ شیخ محمد عثمان ایڈٹس ۱۹۹۷ء دوم

دراگھر سے اے وحید بابر تو نکلو!

سہراہ دلکش نظاروں کے دن ہیں

وہی غزلوں میں کہہ رہی تھی کہ یہی ہے  
حیات و مسائل زندگی کی تصاویر کی ماتی ہیں۔ غزل کی فطر  
میں جو قیامت خیز طوفان پنہاں ہے۔ اس کی بھی انہوں نے  
پردہ دری کی۔ ان کے اشعار میں سائنسی، تاریخی،  
تمدنی، سماجی اور سیاسی ہر موضوع کی ترجمانی ہوتی  
ہے۔ اور جدید انکشافات کے پردے کو بھی ملتے ہیں۔ دور جدید  
کے ہر تقاضے کو انہوں نے اپنی شاعری کے پردے میں جس  
نوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کا جواب بہت کم  
ملتا ہے۔ تسخیر فطرت و کائنات کے علاوہ سائنس کی ترقی انسانی  
کامیابی و کامرانی زندگی کے مسائل اور ان کے حل یہ سب ان کے  
موضوع سخن رہے۔ وہ نور شید جہاں تاب کی تائینا کی کو مانتے  
ہیں۔ لیکن انسان کے اندر موجود قوت کس قدر مستعمل  
نہیں؟ اختراع، امید و امنگ انسان کو سورج سے بھی زیادہ  
مستندہ کرتے ہیں۔

منچلے نہ لور دولا کی ہر جہ  
چاندیرو لٹشیں کہکشاں بن گئی

دلکشیاں سے کے دل شکستہ  
زندگی گمراہی کا دروازا بن گئی

درا سکتے نہیں خونی اندھیری  
گاہ بے دلاں ظلمت کی ہے

اپنی دنیا سے الگ اپنے زمانے سے جدا  
حیرت انگیز مکاں اور زماں اور بھی ہیں  
آج کے انسان کی ہمہ جہت ترقی کو دیکھ کر حیرت کہتے ہیں۔  
ہر گھام پہ گل کھلا رہی ہے  
گشاں میں شرارتیں صبا کی

شعر و ادب کے میدان میں علی گڑھ تحریک ترقی پسند  
تحریک حلقہ ارباب ذوق نئی شاعری جیسے مختلف تحریکیں  
روٹا ہوئیں۔ ادب میراٹے ادب ادب میراٹے زندگی کی آویزش  
ہوتی رہی۔ لیکن وحید نے اپنے آپ کو ایسا شاعر ثابت کیا  
جس کو کسی حلقہ ادب سے الحاق کی ضرورت نہیں۔ ان کے

بوجیب فکروں آزادی ہی میں پھلتے پھولتے ہیں۔ لہذا انہوں نے  
اپنی انفرادیت کو بچائے رکھا۔ وہ ہر گروہ کی خوبیوں سے مستفید  
ہوئے لیکن کسی کی زد میں نہیں آئے۔ ۵

بچاؤ اپنے نشیمن کا سوجن خوب کیا

جو جلیوں کے مقابل بنا دیا تو نے

وحد کے طرزِ خاطر میں جو غزلیں ان کے مجموعہ ہائے کلام  
میں موجود ہیں ان کا رنگ و آہنگ بقول رشید حسن خاں:

" ہر مصرعہ میں واقعتاً یا دوا کا چہرہ لگا ہوا ہے۔

کسی گلاب کے تصرف سے اشعار مہکتے ہیں

اور ان کو پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ دیکھ کر

کہا ہو جیسے، یہ صداقت اور تکلف سے بیری

یہ انداز ان کے اشعار میں تاثیر اور دلکشی

پیدا کرتا ہے یہ بات ملحوظ رہے کہ وحد کی عاشقی

تمنا اور آرزو کی ناتمامی کی داستان رہی ہے

اور اس سلسلے میں کسی کا یہ مصرعہ ان پر صادق

آتا ہے کہ دکھ گئی احتیاط عشق میں عمر



اس میں دل خون تو ضرور ہوتا رہا۔ اور یہ  
 خوشیاں غم تو ضرور بخشی رہیں۔ لیکن وہ  
 ابتذال ان کے قریب نہیں آ سکا جو کبھی کبھی  
 کامرانی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس میں جگر  
 خون جتنا بھی ہوا ہو لیکن غزل کے شعر  
 مہک اٹھے ہیں۔ اور اس سرخو شمی کے رنگ  
 میں ڈوب کر نکھر گئے ہیں۔ جس کو آرزوئے مسلسل  
 کا عطیہ کہنا چاہیے۔

ان کے مخصوص طرز کی غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ رنگ لایا دوانا پین میرا سی رہے ہیں وہ پیرن میرا

یادوں سے چیراغاں ہے شبستان سخن میں

۲۔ حسن ترے نقش قدم یاد رہیں گے

خوشی ندم و ہشتگی آداب الفت میں

حریم ناز میں اے شمع جل آہستہ آہستہ

۳۔ رشید حسن خاں "وجہ کی شاعری چند اشارے" وجہ شخص و خانہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ ۱۹۵۷ء

کوئی جلدی نہیں نشوونما کی بارغ ہستی میں

ہکتے ہیں گل علم و عمل آہستہ آہستہ

نئی نظم جس طرح صرف نشاط و انبساط کو سب کچھ نہیں

سمجھتی ہے۔ اسی طرح نئی غزل بھی ہیں حظ کے محدود جھلاؤ

سے نکالتی اور ریزو ایسا کی نئی سمتوں میں نئے تجسس و نئے ذہن

کے ساتھ لے جاتی ہے۔ اور مانوس زبان میں ترسیل کا موقع

فراہم کرتی ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے خیال میں:

”آج کے طرز احساس سے شاعر ہم آہنگ

ہو تو پرانے انداز کی غزل کہتے کہتے اسی

کے اندر سے نئی غزل کا دھارا پھوٹ

نکلتا ہے۔“ لے

وجہ تو غیر جدید غزل کے رسیا نہیں تاہم ان کے اشعار میں

جدید غزل کا لہجہ ملتا ہے۔ اور بعض ایسے بھی اشعار ملتے ہیں

جو ان کے نئے پن کی سناسندگی کے لئے کافی ہیں۔ لے

لے خلیل الرحمن اعظمی، ”نشاط شاہد“، ”جدید غزل“

معیار پبلیکیشنز نئی دہلی ۱۹۷۷ء

آگہی اپنی خطا ہو جیسے

پے بسی اسکی سزا ہو جیسے

وجہ خوشیوں کے سراپوں میں ہے گم

ہر خوشی غم سے جدا ہو جیسے

سکارواں لوٹ سے کوئی خبر بچا

راہزن رہتا ہو جیسے

رات بھر خون روئے ستارے

تب سہاں سحر مکرال

بات کہتا ہے جو کھری اکثر

وہ بھی سنا نہیں ہے بات کھری

اور تو آئینہ میں عیب نہیں

صاف دل ہے یہی برائی ہے

وجہ نے دل حساس اور تیز پر کھنے والی نظر پائی

تھی۔ ان کی بینائی کسی بھی چیز کے حسن کی تہہ تک

پہنچ جاتی ہے۔ لیکن وہ اسکی قباحیت سے پہلو تھما کر تے

ہے۔ اس کی مبیع و مرشت سے یا تو نظر پھیر لیتے یا پھر

اس کو نظر انداز کر دیتے۔ وجد اکثر چشمے صمد صمد  
کو ٹھیک اتنے فاصلے پر رکھتے تھے جہاں سے ان کو ہر چیز  
کی خوبی و اضع دکھائی دیتی ہر چیز کی خوبیوں کو محسوس کرنے  
کیلئے وہ بڑی سریع الذہنی کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن اسکی  
خند میں انہوں نے کسی شخص یا شے کی مذمت یا تضحیک  
کے لئے کبھی عجلت نہیں کی یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایسے  
اشعار کا فقدان دکھائی دیتا ہے جن میں کسی کی تضحیک ہوتی ہو  
ڈاکٹر معنی تبسم نے لکھا ہے۔

”اس مزاج کا خاصہ یہ ہے کہ وہ قبیح و زشت  
کی طرف سے اپنی نظریں پھیر لیتا ہے یا پھر خراج  
کے مشاہدے میں ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھتا ہے  
کہ اشیا کو اتنے فاصلے سے دیکھا جائے کہ وہ  
حسین اور دلکش محسوس ہو۔“

ان کی غزلوں سے ان کے فتون لطیفہ سے شغف کا راز افشا  
ڈاکٹر معنی تبسم مبرعاً اچ دی اچ دی نظائس اردو

ٹرست لائبریری حیدرآباد دکن

ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر صفی الدین صدیقی :

” وحید کی غزلوں میں غمناک غنائیت اور شیرینی  
ہے۔ وہ مجسمہ سازی کی طرح الفاظ کو تراش کر  
نوع بصورت بت کی صورت میں ہمارے سامنے پیش  
کر رہے ہیں، اے

یہی نرمی و غنائیت شیرینی اور خوبصورتی ان کی فنون  
لطیفہ سے دلچسپی کی غماز ہے۔ وحید الفاظ کے جادوگر ہیں۔  
ان کو ایسے ترتیب دیتے ہیں کہ ہمیں موسیقیت، موزونیت اور  
غنائیت یکجا محسوس ہوتے ہیں۔ پیکر تراشی کے ایسے ایسے  
نمونے ان کے ہاں موجود ہیں کہ مصوری و سنگ تراشی بے  
جان معلوم ہوتی ہے۔ ۵

زندگی رقص میں ہے ساقی گلفام کے ساتھ

نبض کو نین لرزاتی ہے خط جام کے ساتھ

ڈاکٹر رشید حسن خاں اپنے مضمون میں وحید کے شاعرانہ

۱۰ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی ”سکندر علی وحید شخصیت اور فن“

روزنامہ سیاست حیدرآباد

وسجد کی غزلوں کی منفرد خصوصیت وہ بروائی اور نفلی

ہے جو انہیں دوسرے شعرائے عمیقہ کرتی ہے۔ نشاطِ خاطر کے

لمحات مہیا کرنے والے اس شاعر نے اپنی غزلوں میں سماجی

مفاد کو ملحوظ رکھ کر فلاح و بہبودی نئے موضوعات کو نہیں سمو

سکا۔ اس کے باوجود ان کے ایک ناقد دوست (اشفاق حسین)

جو پہلے کہتے تھے کہ وسجد کا شاعرانہ مزاج مخدوم کی بنیست

سماج کی آگ میں تپا نہیں۔ لکھتے ہیں۔

"بیاض مریم کی غزلوں میں مجھے پہلی مرتبہ وسجد

کے کلام میں ایک قسم کا سوز و شکستگی کا

احساس ہوا"۔ لے

شکستگی کا یہ احساس انہیں تلخیِ ایام سے ملا

کچھ زوال ریاست حیدرآباد سے، تو پھر کچھ لسانی بنیادوں پر

صلوبوں کی تقسیم جدید کی وجہ سے، جس کے نتیجے میں ان کے

دو پسندیدہ شہر حیدرآباد اور اورنگ آباد کو دو علیحدہ ریاستوں

میں منقسم کر دیا گیا۔ ایسے میں بھلا وسجد کے دل کو کیسے ٹھیس نہ پہنچی ہو

لے اشفاق حسین "بیاض مریم" سوئیر حسن وسجد اورنگ آباد

تحقیق کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہیں:

• موضوع کے لحاظ سے وہ رومانی شاعر ہیں  
 رقص مصوری اور موسیقی سے ان کی طبیعت  
 کو جو نسبت خاص ہے اس کے اثر سے  
 بیان میں خمگی کی بہرہ رواں دواں  
 رہتی ہیں بیان کے لحاظ سے نفیس تعبیرات  
 اور روشن استعاروں سے کام لینا ان کا خاص  
 انداز ہے۔ استعاروں کی مدد سے نقش اور  
 تصویر کے ہلکے گہرے عکس ان کے کلام میں

نمایاں رہتے ہیں۔“ لہ

وحد اکثر مترنم بحرول کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں بقول  
 سردار جعفری:

”ہلکی پھلکی اور مترنم ہیں اور ان کی آواز کا

ساتھ دیتی ہیں۔“ لہ

لہ رشید حسن خاں ”وحد کی شاعری چند اشارے“ وحد شخص و شاعر

یہ علی سردار جعفری ”تبصرہ“ ہفتہ روزہ بلتجر بمبئی۔

اس کے بعد مہاراشٹر کے چیف جسٹیس نے ایل۔ ایل۔ بی  
کی سند نہ ہونے کی وجہ سے مزید ان کی ترقی کے رہنموں  
کو ختم کر دیا۔ بقول جناب محمد علی عباسی :

” حیدر آباد سیول سروس کی قانونی تعلیم اور  
بیسوں کے عدالتی تجربے کو نظر انداز کر لے  
ان کو اور ان کے جیسے ہمارے بھائیوں کو اصل  
محکمہ عدالت کی خدمات سے ہٹا کر دوسری  
نیم عدالتی خدمات پر منتقل کر دیا۔ کیوں کہ  
ان لوگوں کے پاس قانون کی رسمی نگاہیں تھیں لے  
شاید یہی ”سردھری کی وجہ سے وسجد نے بل از وقت  
ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی۔ اور اس کے بعد یوں کہیے  
کہ ان کی شاعری کے سوتے بھی خاموش نہ رہی اس کی رفتار  
میں وہ تیزی نہ تھی۔ لیکن وسجد نے اپنے دلکش اور سلونے  
انداز میں غزل کو دیا اور جو خوبصورت غزلیں لکھیں ان میں  
غم زمانہ کی دھڑکنیں زیادہ نہ محسوس ہوتی ہوں لیکن ایک دیکھ  
لے احسن علی۔ اسکندر علی وسجد ”روزنامہ سیاست“ ۱۴ مئی ۱۹۷۱ء حیدرآباد



ہوئے دل کی تسکین، اے سامان ضرور موجود ہے۔  
احسن علی مرزا کے بموجب:

”مخدوم کی نظم ہو یا مسجد کی منزل وہ وقت و  
زمانہ کے قدموں کی چاپ بن جاتی ہے۔ یہ  
درست ہے کہ مسجد نے مخدوم کی طرح بہت  
عرصہ تک ”دشت سیاست“ سے اپنے تلوے  
اہولہاں کرنے سے احتراز کیا۔“ لہ

وسجد کے موضوعات غزل گہرے اور گہیر نہیں سیدھے  
سادے دو ٹوک دو اور دو چار ولے ہیں۔ لیکن تاثیر کے اعتبار  
سے بے پناہ اور ایسے کہ پڑھیں اور سیدھے دلنشین ہوں ان  
کے ہاں فلسفہ و فکر کی زیادہ کارفرمائی نہ رہی ہو لیکن انسانی  
جذبات کی ترقیاتی میں ان کی مثال کم ہی ملے گی پھر ان کے کہنے  
کا انداز ”مستزعم جبریں“ الفاظ کے انتخاب میں احتیاط اور دلکش  
اسلوب بحیثیت غزل گو ان کو اردو ادب میں کوئی اونچے مقام  
کا حامل نہ بنادیتا ہو لیکن ایک معتبر اور موقر حیثیت کا حامل ضرور بناتا ہے  
لہ احسن علی مرزا سکندر علی وسجد ”روزنامہ سیاست“ ۲۳ مئی ۱۸۳۷ء حیدرآباد

# وحید کا مرتبہ

## اردو شاعری میں

وحید کی شاعری کے اس سیر حاصل جائزے کی روشنی میں بہر صورت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری میں وحید کی آواز منفرد ہے۔ وحید کے دور میں اردو شاعری کئی رنگوں اور رجحانات سے دوچار رہی۔ جن میں روایت سے ہٹاوت کی لے قدر اوچی ملتی ہے۔ وحید کا کہاں یہ ہے کہ انہوں نے قطعی روایتی شاعری تو نہیں کی۔ اسی طرح انہوں نے اپنے دور کے رجحانات کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ مطالعہ کیا اور جہاں تہاں ان سے استفادہ بھی کیا، لیکن ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنی رجحانات میں اردو شاعری کی نجات متصور کی ہو۔ وحید نے قدیم

وجہ یہ سے لیتے دیتے اور اپنے حسبِ توفیق ان سے اخذ و  
اكتساب کرتے ہوئے اپنی راہ آپ نکالی ہے۔ یہ درست ہے کہ  
ان کے ہاں کلاسیکی غزل کا ڈکشن بھی ملتا ہے۔ لیکن ان کی  
غزلوں کے مطالعے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وجہ کی غزل  
کلاسیکیت کی آواز باز گشت ہے۔ ویسے عصمت جاوید کے  
اس خیال کو رد نہیں کیا جاسکتا:

”ان کے کلام میں عصری شعور عصری مسائل اور

اپنے عہد کے بدلتے ہوئے حالات کا شعور اپنی

بھرپور توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن ان کا

اظہار انتہائی نپے سٹلے انداز میں پورے کلاسیکی

رہاؤ کے ساتھ ہوا ہے۔ لیکن ان کے فنی جوہر ان

نظموں میں زیادہ کھلے ہیں۔ جن کی اساس جمالیاتی

فکر و احساس پر مبنی ہے۔ ادب کی جمالیاتی قدسی

سیاسی قدروں کے مقابلے میں زیادہ پائیدار ہوئی ہیں۔“

عصمت جاوید شاعر جمالیات سکندر علی وجہ ”وجہ شاعر و شخص“

مکتبہ جامعہ لٹریچر نیو دہلی ۱۹۷۹ء

وہجد نے غزل کو نئی تراش تراش نہیں دی اور نہ  
مسائل حیات کو ایسے اچھے کلام کا موضوع خاص بنایا۔ اس  
کے باوجود نہ وہ زندگی سے بے خبر رہے اور نہ زمانے سے  
بہرہ ایسا سبب ان کی غزل موضوعات، رجحانات اور اسالیب  
کا ایک دلاویز مرقع بن جاتی ہے۔ یہی حال نظم نگاری کا ہے  
وہجد کی منظومات مسالیں نہیں موضوعاتی ہیں۔ انہوں نے ان  
موضوعات کے انتخاب میں کسی تنگ نظری اور ذاتیات کو ذہیل  
ہتیں کیا بلکہ ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہوئے نفاصی کشادہ  
دلی و وسیع النظری اور بحیثیت مجموعی ہم وطنوں کے جذبات و  
احساسات کی ترجمانی کی خواہ ان کی نظمیں ایلورا، اجنتا  
تاج محل ہوں یا عبدالرزاق لاری، چکبست، محمد علی (جوہر)  
جواہر لال (نہرو) اندرا گاندھی یا ان سے ہٹ کر رفاصہ، طیبہ  
پیروین، سلطانہ، اور نعمت کی موت وغیرہ موضوعات کا یہ  
شعاع زندگی و زمانے کے مختلف رخوں سے وہجد کی جذباتی  
والستگی کا اظہار ہے۔ ان موضوعاتی منظومات کا آہنگ  
و اسلوب بھی روایت سے جدا اور تجاوزت سے دور رہتے ہوئے

ان دونوں سے استفادے کا اظہار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ  
 پروفیسر عبدالقادر سروری کو "ہیئت و اظہار کمزیر رکھنے والے  
 اور انہیں کلاسیکی معیاروں کے ساتھ سمجھنے والے" وحید  
 کے ہاں "نئے انقلابی القورات" کی فراوانی دکھائی دیتی ہے ان  
 کے کلام میں ان کے پیام کے علاوہ انکا ایک مخصوص و منفرد لہجہ  
 و طرز بیاں بھی پایا جاتا ہے۔

وحید کے کلام میں امیدور حیا کی بجائے کارفرما ہے  
 نشاط و انبساط کی فراوانی ان کی شاعری کو طرب و مسرت سے  
 ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو انہیں  
 دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہیں۔ وحید نہ صرف لشاط و جمال  
 کے شاعر تھے بلکہ ایک صاحب کمال فنکار بھی تھے۔ ان کی  
 شاعری طرب و مسرت، عمدہ شعریت کی زندہ مثال ہے  
 جس میں مسائل و دوراں اور مسائل جاناں کی آمیزش بھی ہے  
 القورات کی پسیر تراشی بھی ملتی ہے۔ ان کے اشعار میں  
 فن اپنے پورے نکھار کے ساتھ منظر پر آتا ہے۔ ان کے  
 تفکر و تصور کے پسکروں میں وہی نزاکت، وہی تازہ، وہی نکھر

ستھرا لہجہ ہے۔ جو اجنتا، ایلورا کے اصنام کی عراش خراش  
 میں ملتا۔ یہ الفاظ دیگر ان کی شاعری نزاکت خیال کا دلاویز و  
 دلکش نمونہ ہے۔ جہاں موضوع کی یہ نسبت شاعر کے  
 خیالات کا بائکن بڑی طرنگی سے نمایاں ہوتا اور جذبات و  
 احساسات کی لطیف و خوشگوار ترجمانی ہوتی ہے۔ جیسا کہ  
 سلیمان اظہر جاوید کا خیال ہے :

”وحد کی نظم تاج محل کا ایک مصرعہ ہے۔  
 ”چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی“  
 یہ خود وحد کی نزاکت خیال کی بھی دلاویز

مثال ہے۔“ لہ

وحد کے اشعار میں بادِ مصر کی تیزی و تندہی نہیں شمیم  
 شبنم کی مٹکی ہے صریح خامہ بھی نسیم صبیحہ کی طرح سبک  
 اور سحر آفریں ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور ان کا بجا و بر محل استعمال  
 گویا وسیع پہنا خالص ہے۔ صاف سلیح ہوئے شستہ و شگفتہ  
 الفاظ و لہجہ شائستگی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ وہ ایک

قادر الکلام سخن ور تھے لہذا سخن طرازی و سخن سنجی کے فن اور  
 الفاظ کے صحیح استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی لفظیاً  
 کا سرمایہ نئے پن اور طرح داری کا حامل ضرور ہے لیکن ان میں  
 وہ فلسفیانہ رنگ و روش نہیں جو اقبال کے یہاں ملتا ہے۔  
 عزم سرشار، دولت بیدار، نقش بدلیوار، چشم بیدار، سرور عزم و  
 فیض غم آشنا گاہ، شیوہ اہل دل، امن کا پھول، موجِ اہل  
 نگہ ناز، دلبر، دل باز، منچلے، مہ نور دوں، غسیرتِ نابید، یارِ کم سخن  
 لطفِ بزمِ راز، جیسے مرکب الفاظ کو نئی معنویت کے ساتھ استعمال  
 کیا گیا ہے۔ غرض وجہ کا کلام الفاظ کا ایک خوشنما نگار خانہ ہے  
 جہاں لفظ کی معنویت کو طرح طرح پہلو بہ پہلو پوری خوبی سے نمایاں  
 کیا گیا ہے۔ اور شعبہ عدل و انصاف سے ان کا اتساک ان کے  
 فن پر کافی اثر انگیز ثابت ہوا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بموجب:

” لفظ کی مزاج شناسی اور اس کا برجستہ

استعمال وجہ کے اشعار کو صوری

جس اور معنی افرینی عطا کرتا ہے

وجہ کہتے ہیں کہ وہ میں نے قانون سے لفظ کا

احترام اور محتاط استعمال سیکھا ہے، ” لہ

اس اقتباس کو ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے الفاظ سے مزید  
تقریر ملتی ہے۔ جو وحدہ کے ہم وطن بھی ہیں۔

” وحدہ کو میں نے یہ کہتے سنا ہے۔ اس پیشہ کا

مثبت اور صحت مند اثر مجھ پر یہ پڑا ہے کہ ہر تخلیق

کی تکمیل پر میں یہ دیکھ لیا کرتا ہوں کہ آیا میں نے

موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے یا نہیں۔ ” لہ

وحدہ کے اشعار میں الفاظ نگینوں کی طرح ترشے ترشے

بڑے ہی سلیقے سے سجے دیھے نظر آتے ہیں۔ سادگی و سہجائی

جو ان کا خاصہ ہے وہ خود وحدہ کے رکھ رکھاؤ، تہذیبی رجحان اور انکی

ظہوری کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید رقمطراز ہیں:

” وہ اپنے تخیل کی لالہ کاری سے ماضی کی مصوری

کرنے میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں

لہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ”وجہ کی ظلم نگاری“ وحدہ شاعر شخص ” مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ٹی ڈی ۱۹۸۴ء

صفی الدین صدیقی سکندر علی وحدہ شخصیت اور فن روزنامہ سیاست

سعید آباد الہی ۱۹۷۷ء



الفاظ کی تراش و تراش پر روان کی توجہ خوب

ہوتی ہے اور قدرتِ کلام کے باعث روانی

نصاحت دیدنی ہے۔ ۱۷

نصاحت، لطافت اور شعریت کے امتزاج کے ساتھ ساتھ

صاحب شعر کا خونِ دل شعر میں شامل ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

وجہ کی شاعری جلد ہی مقبولیت کے اوج پر پہنچ گئی، ڈاکٹر ذاکر حسین

اپنے ایک مکتوبِ موسومہ ”وجہ“ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۷ء میں

لکھتے ہیں:

”نقاد نہیں ہوں مگر الفاظ کی نبضوں میں خون جگر

رواں ہوا اور کسی نے ہر شعر میں دل و دھڑکن

بھری ہو تو نقاد نہ ہوتے ہوئے بھی یہ پسند نہیں

آتے جی میں اتر جاتے ہیں۔“ ۱۸

یہ منظر لکھش کبھی دیکھا کبھی نہ ہوگا

الفاظ کی نبضوں میں رواں خون جگر دیکھ

۱۷ ڈاکٹر سلیمان طاہر جاوید ”تقدیرِ شعر“ نیشنل بک پبلیشرز، حیدرآباد ۱۹۷۱ء

۱۸ ڈاکٹر حسین مکتوب بنام ”وجہ“ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۷ء

کہاں شرق و آند و عیاں ہے حرف حرف سے  
جواں تخیلات کی بغاوتیں لئے ہوئے

وجہ کے کلام کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے جیسے وجہ نے  
شاعری نہیں کی بلکہ تبسم حیات و جمال کائنات کے حسین حوادث  
و تجسس و واردات کو یکجا کر دیا ہے۔ گلستان حیات کی بہار غم فکری  
اور چین امید کے صفِ سرو سمن خوبا بنیم ہستی و رونقِ عالم کو گلستانِ  
سخن سے روشناس کیا۔ ان کے کلام کا ہر مصرعہ ہر لفظ شانِ جمالی  
کا مظہر ہے۔ انہوں نے چونکہ اپنی شاعری کی اساس خوب سے  
خوب تر پر رکھی تھی لہذا وہ ہر کس و نا کس کو خوشنما نظر آتی ہے  
اور قاری دیکھنے سنتے اور پڑھنے غرض ہر فعل میں سرور و شادمانی  
طرب و نشاط مسرت و انبساط محسوس کرتا ہے اور اسکو یہ  
کلام فطرت کے جان کی تراوش کا ٹکڑا ستھامرقع نظر آتا ہے۔  
ان جالیاتی پہلوؤں کے ماسوا و تجید کے کلام میں حیات  
و کائنات کے دیگر مسائل بھی اپنے وجود کی سادگی کرتے ہیں۔  
وجہ حسن پرست و حسن پر کھ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ حسن  
دل بھی رکھتے تھے لہذا ان کے کلام میں عصری حسیت کا فقدان کمال

نہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

”ہر تخلیق خواہ کتنی ہی ذاتی اور انفرادی ہو،

اپنے عہد کے معاشی، تہذیبی، سیاسی، ادبی

تعلیمی اور فنی عمل اور رد عمل سے وابستہ ہوتا

اور اس سے نمونپاٹا ہے۔ اس میں رورج عصر یا

تاریخیت کی کسی بات کسی حد تک جلوہ گری ہوتا

ہے۔“

اس لحاظ سے بھی وحید کے کلام میں حیات و کائنات کے

مسائل کی واضح نمائندگی ملتی ہے۔ ان کا کلام مسائل حیات کا

قطعی نمائندہ نہ سہی جہاں تہاں اس کی نمائندگی ضرور کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر سلیمان اظہر جاوید۔

”سائبر علی وحید کی شاعری کا مقصد خود ان کے

الفاظ میں نہ کوئی سیاسی انقلاب ہے نہ کوئی سماجی

اصلاح اسلئے ان کے ہاں مسائل حیات کا بھرپور

تذکرہ نہیں ملتا۔ تاہم ان کا ادبی مسلک جو تکم

لے ڈاکٹر عنوان چشتی ”تنقید سے تخلیق تک“ ۱۹۷۷ء

فن برائے فن کبھی نہیں ہے۔ اسلئے مسائل

حیات کی لہریں ضرور مل جاتی ہیں۔ ان کے ایسے

اشعار میں دل وقت کی دھڑکن سناتا دیتی ہے۔ لے

ہر شعر میں بھری ہے دل وقت کی دھڑکن

ہر نظم میں کیفیت صدمہ شام و سحر دیکھ

وہجہ کے ہاں ہلکے پھلکے نہایت ہی لطیف موضوعات

پائے جاتے ہیں چاہے وہ موضوعات قومی ہوں یا مسائلِ حیات

سے متعلق انہوں نے گیمبیر اور سنجیدہ قسم کے موضوعات سے

اجتناب برتا ہے۔ البتہ جیسے ہی کسی واقعے سے متاثر ہوئے

اس کو اشعار کے پیرائے میں پیش کر دیا۔ یہاں کاتا اور لے پوری

کا سماں دکھائی دیتا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ خود

وہجہ کے الفاظ میں:

”میں اپنے فن کو دشمن کی نظر سے دیکھتا ہوں“ لے

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

لے پروفیسر سلیمان اظہر جاوید ”اسلوب اور انتقاد“ نیشنل بک لوپ چھپائی گمان حیدرآباد ۱۹۶۴ء

لے سکندر علی وجہ میں اور میرا فن سبقت روزہ بلٹرن پبلشرز لاہور ۱۹۷۸ء بمبئی

”میں ہمیشہ اپنی نظموں میں ترمیم تفسیح اور اضافے  
 کیا کرتا ہوں تمام فنون لطیفہ کی طرح شاعری  
 بھی ایک بڑا ریاض چاہتی ہے۔ اعلیٰ شاعری  
 کی منزل تک پہنچنے کا کوئی آسان اور قریب کا  
 راستہ نہیں ہے۔“ لے

وہجہ کے بموجب اچھا شعر کہنے کا سلیقہ ہر سوں کی ریاضت و مشقت  
 کے بعد ہی آتا ہے۔ لہذا وہ اشعار کی تخلیق سے پہلے اپنے قصور  
 و نقائص کو ذہن کی سبھٹی میں خوب تلپنے کا موقع دیتے ہیں۔ لے  
 تب گرم سخن کہنے لگا ہوں کہ میں اک عمر  
 جوں شمع سر شام بجتا صبح جلا ہوں

فکر کی آگ میں بنتا ہے سخن

حرف پر سوز دعا ہو جیسے

شمس الرحمن فاروقی نے وہجہ کی شاعری کے ایک  
 حصے کو پیش یا اقتادہ سطحی اور غیر قطعی شاعری سے تعبیر کیا ہے۔

ان کے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ:

لے سکندر علی وجہ میں اور میر تقی ”ہفت روزہ بلبلز“ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء بمبئی

” شاعر کے ذہن میں اس تجسس، کرید، بے حیعی  
اور کرب کا کمی ہے جو اسے کسی چیز کی صوری قیمت  
کو قبول کرنے سے روکتا ہے۔“ لے

وحدہ کے مزاج میں چونکہ فلسفہ کا دخل نہیں اس لئے ان کے کلام  
سے فلسفیانہ کرید و تجسس کا اتفاقاً نہ کرنا مناسب نہیں۔ جس کے  
نتیجے میں خود اپنے ہی وجود و غیر وجود کا تنازع کھڑا ہوتا ہے۔ وحدہ نے  
محض نشاطِ خاطر کے لئے شاعری کی ہے اور خود ان کے خیال میں  
ان کی شاعری تاریخی، سیاسی واقعات اور فنونِ لطیفہ کی ناسندگی  
کرتی ہے۔ اس سے انہیں خود پورا اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ ایسی  
شاعری کو کسی دوسرے چوکھٹے میں کسنے سے کھلا کیا حاصل۔  
جس شاعر کو خود یہ احساس ہو کہ اس کی تخلیق وقت کے حوصلوں  
ضرورتوں اور آرزوؤں کی پوری ترجمان نہیں، اس پر الزام طرازی  
بے جا ہے۔ ہر تخلیق چاہے کتنی ہی ذاتی و نجی ہو نہ مانے سے دھڑکیں  
رہ سکتی۔ اسی طرح وہ چاہے کتنی ہی اجتماعی ہو اس میں ذات و  
صفات کے پر تو نظر آتے ہیں۔ جن میں شعریت، موسیقیت، غنائیت  
لے شمس الرحمن فاروقی، فاروقی کے تبصرے، شبِ خون کتاب گھر، آبادی، ۱۹۷۷ء

کلاسیکیت، روایت اور فصاحت کی خوش رنگ آمیزش ہے۔  
 ان کا کلام ایک معجون ہے دکن کی شعری روایات کا، اور وہ اس  
 روایت کے مخصوص نمائندہ ہیں جس کو ہر دم اپنے ورثہ کا خیال و  
 احترام تھا۔ اس ضمن میں رشید حسن خاں کا یہ قول بر محل رہے گا۔

”شدید جمالیاتی احساس مسرت اور لذت کے  
 حصول کا جذبہ یہ اختیار اور نغمگی و نقش کاری  
 کی پرستش دکن کے ایک البیلے فرماناروا ●  
 قلی قطب شاہ کی ذات میں یہ اجڑے مثال توازن  
 کے ساتھ اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ اس کی ذات  
 ادبی جمالیات کا گارخانہ بن گئی تھی۔ یہ نورچیں چچا  
 اس علاقے میں بیستار ہا ہے۔ اور واضح طور پر  
 محسوس ہوتا ہے کہ اس قطب شاہی روایت کا  
 کچھ نہ کچھ حصہ دکن کے کئی شاعروں تک پہنچا ہے  
 اور ہمارے زمانے میں اس فہرست میں وحدہ کا نام  
 سرفہرست نظر آتا ہے۔“ اے

اے رشید حسن خاں ”وحدہ کی شاعری چند اشارے“ وحدہ شاعر و شخص  
 مکتبہ جامعہ لئیبیڈی دہلی ۱۹۶۷ء

وحدہ زکرم لہا انقلاب آفریں لغزہ لمبہ نہید کیا اور تہ ہی  
 شاعری میں نے رُحیت انگیز اور چوکا دینے والے تجربے کئے۔  
 ان کی شاعری بے دھڑک جذبات کی مظہر بھی نہیں۔ اور ساتھ ہی  
 طنز و تلخی شسطہ نوالی، آتش فشانی جیسے خواص سے عاری بھی  
 ہے۔ وحدہ جس اخلاص شعری روایت کی ترجمانی کرتے ہیں وہ  
 بقول ڈاکٹر وحید اختر:-

”کلاسیکیت کو عصر حاضر کے احساس اور فکر

سے بغیر کوئی مخصوص قیام نہیں دے جوتی ہے۔“ لہ

سمجھ تو یہ ہے کہ قانون سے ان کی وابستگی تے ان کو ادبی

زمرے میں بھی قوانین و ضوابط کا پابند بنایا اس کے ساتھ ہی ان کے

مزاج کی احتیاط پسندی کو بھی ملمو ظار کھا جاسکتا ہے۔ ان کی

شاعری میں روانی افکار و روایت کی پاسداری ملتی ہے۔ لیکن

انہوں نے کلاسیکی رنگ دھنگ اور بہت وحدہ کو بھی برقرار رکھا

یہی وجہ ہے کہ اکثر انہیں قدامت پسند کہتے ہیں ڈاکٹر وحید اختر کا

یہ بھی خیال ہے:-

لہ ڈاکٹر وحید اختر ”بیاض مریم کا شاعر“ ہفتہ روزہ ہماری زبان نئی دہلی یکم دسمبر ۱۹۷۰ء



” وہ فارم اور زبان کے معاملے میں یقیناً قدامت

پسند ہیں لیکن ان کی نظمیں ایک روح بڑی حد تک

قدامت ممکن ہے“ لہ

وہ جبکہ اسلوب ایک انوکھا اسلوب نہ سہی انفرادیت کا

حامل ضرور ہے۔ ان کا کلام شعریہ و تغزل، نعت و مہجراں مرکب ہے

دھیمپن سرود و سرشاری کی خراما روی، سادگی و سہ کاری بھرت

وصفائی اور لطافت کی بے شمار مثالیں ہیں۔ ان کے موضوعات

بولتے ہوئے زندہ متحرک زلیست و زمانے سے وابستہ ہم آپ میں

چلتے پھرتے رہتے بستے ہیں۔ ترسیل و ابلاغ کے معیار پر وحد کی

شاعری کھری اترتی ہے۔ ان کے اشعار ابہام یا اہمال زدہ

نہیں۔ انہوں نے بعض جدید شعراء کی طرح اشاریت کے نام پر

یہ مصنویت کو بھی نہیں اپنایا ابتدائی دور میں وہ اکثر آشفقہ مزاج

شاعر کی حیثیت سے نمایاں تھے لیکن یہ آشفنگی دھیرے دھیرے

سنجیدگی میں تبدیل ہو جاتی ہے طبیعت کی جولانی عمر کے بڑھنے

کے ساتھ ساتھ گھٹتی نظر آتی ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام

لہ ڈاکٹر وحید اختر ”بیاض مریم کا شاعر“ ستمبر ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا

وحید نے بندھے ٹکے انداز سے ہٹ کر معرا اور آزاد

منظومات بھی لکھی ہیں۔ لیکن وہی نکھر استہر انداز وہی غنائیت

اور شعریت کا امتزاج وہی کیف و سرور اور وہی تازگی و شگفتگی

ان کے اشعار میں ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے

طرز کلام و رنگِ سخن کے لئے ان کا تخلص نہایت ہی موزوں

اور مناسب ہے۔ کیونکہ وحید کا کلام وحید آور ہے۔ بقول محمد طفیل صاحب:

”وحید کی شاعری وحیدان کی دنیا ہے“ ۱۷

سید محی الدین قادری زور کے خیال میں ان کے کلام میں:

”جذبات کی تازگی اور رنگینی نمایاں رہتی ہے“ ۱۸

اب تک قانون جیسے خشک شعبے سے فتون لطیفہ کا

شاید ہی نباہ ہوا ہو لیکن وحید کو ایک قانون دان ہونے کے

باوجود فتون لطیفہ سے وابستگی رہی۔ جیس کا اظہار ان کے

بے شمار اشعار سے ہوتا ہے۔ اگر وہ قانون سے وابستہ نہ ہوتے

تو شاید یہ شغف اور نکھرتا۔ بقول شاذ ستمگت:

”ماہنامہ نقوش لاہور شخصیت نمبر جنوری ۱۹۵۵ء

۱۷ سید محی الدین قادری زور داستان ادب حیدر آباد ادارہ ادبیات اردو لاہور

"ہو ترنگ کی شاعری وجہ کو ایک ہواں سال رومانی مزاج شاعر کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ جبکہ آفتاب تازہ میں ان پر قومیت و وطنیت کا جذبہ حاوی نظر آتا ہے اور ان کا عشقیہ سنوڑو گداز کچھ ماند پڑ جاتا ہے۔ اوراق مصور اور بیاض مریم کے منظر عام پر آتے آتے بقول ڈاکٹر معنی تبسم:

"اس مجموعے (بیاض مریم) کے مطالعہ کرتے ہوئے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی پرانے دوست سے ملیں اور اس میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہ کریں سوائے اس کے کہ اب اسکی طبیعت میں جولانی کچھ کم ہو گئی ہے۔"۔

ان کی رومانی منظومات جنکو ہم عشقیہ منظومات کے زمرے میں لا سکتے ہیں کل رات کو، طیرے بغیر، شباب و خواب کی دنیا، نیلی ناگن، خاص عمر، کل صبح، آہستہ گندہ، اے دوست، آج کی رات ویرہ ہیں لیکن ان کی ہر نظم تقریباً ہر شعر میں رومانی پہلو ضرور کل آتا ہے۔

لے معنی تبسم، بیاض مریم، ماہنامہ مبصر، آج دی نظاس اردو ٹرسٹ حیدرآباد  
مارچ ۱۹۷۷ء

موسیقی و تہذیب کا اہم موضوع ہے۔ انہوں نے کئی

نظریں اس موضوع پر رکھی ہیں۔ لے

ان کے کئی منظومات فنون لطیفہ اور خود موسیقی سے ان کے

والہانہ گانے کی شمار میں جن میں موسیقی، طیبہ، رقاصہ، حسین کا

آرت اور دوروں کا پیغام، اجنٹا الیورا وغیرہ و تہذیب نے موسیقی

کو فنون لطیفہ کی انتہا قرار دیا ہے۔

رنگ و الفاظ کے ضبار سے پاک

آرت کی انتہا ہے موسیقی !!

ان کی بعض منظومات جو خصوصاً فنون لطیفہ کی توصیف میں

لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر سطح آفاقیت کے حامل ہیں۔ اجنٹا الیورا

اور جامعہ عثمانیہ کے مزدوروں کا پیغام فطرتاً کسی ایک طبقہ

اور مقام کے لئے مختص نہیں بلکہ ان مقامات کی نمائندگی کرتے

ہوئے بھی دنیا کے ان عظیم الشان تعمیرات پر منطبق ہو سکتی ہیں

جن کے معماروں نے اپنے خوابوں کو جگر سے ان کی آبیاری کی

ہو، اور سب کے قلب و نظر کے لئے جنت کے بخونے چھوڑ دیے۔

شاہنشاہت بیاض مریم روزنامہ سیاست حیدرآباد، ۱۰ مارچ ۱۹۵۷ء

ہم نے نقش ہوس خام نہیں چھوڑا ہے

کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

یہ ہر شاہکار پر منطبق ہو سکتا ہے۔ اور ہر فنکار کے لئے

خراج عقیدت ان خارا شگافوں اور مصوروں کو بھی جینکے تیتے  
اور مو قلم ایلور اکھوڑا اور اجنتا کے نمونے بنائے و نیز ان متدرج

کی ضامی کے لئے بھی جو مدھورا راٹھشورم امہا بللی پورم وغیرہ میں  
پائے جاتے ہیں۔ اور ان معماروں کے لئے بھی جن کی کاوشوں نے

احرام مصر، الحمرا، آمبیر کے محل، قطب مینار، مسجد قرطبہ، تاج محل  
ایفل مینار جیسی مایہ ناز تعمیرات کو کرہ ارض پر استادہ کیا ہے

جہاں کھینچتا رہا پتھر پہ عکس خیر و شر برسوں

اور کچھ جہاں قائم رہے کی جنت قلب نظر برسوں،

کے ذیل میں بر نداین اور اور بایل کے انوکھے باغات تصویف میں  
اُجھاتے ہیں۔ جہاں واقعی قلب و نظر کو جنت کے نظارے رکھائی

دیتے ہیں شمس الرحمن فاروقی نے اجنتا ایلور منظر و مات پر

تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے :-

”یہ نظمیں محض لفظی توازن اور الفاظ کے ہامیانہ پن کا

مجموعہ ہیں۔ بقول ٹریل Trail ان کو پٹرھکر  
 کوئی پیکر ایسا نہیں ابھرتا جو چشم تخیل کو متوجہ  
 کرے اور نہ کوئی خیال ایسا جنم لیتا ہے جو ذہن میں  
 جڑ پکڑ لے۔“ لے

اس طرح کی تنقید کرتے سے پہلے ناقد کو چاہیئے تھا کہ دیکھیں  
 یہ نظم کس پس منظر اور کس ماحول میں لکھی گئی ہے۔ اور اگر اس  
 کی اس سے بہتر تر جانی ہو سکتی ہے۔ تو اس پر آیا اب تک  
 کسی دوسرے فنکار نے قلم اٹھایا ہے یا نہیں؟۔ اگر اس سے  
 بہتر ہونی تھی تو بھلا کیسی ہونی چاہیئے تھی؟ اگر موصوف ججن  
 وجہ کے پیش کردہ سارے سرود کے پیر و گرام میں پمدہ سہین پر  
 ان مشطہ زبان کی سماعت کرتے تو ممکن ہے وہ ایسی تنقید سے باز  
 آتے۔ اجنٹا الیوراکے غار ہماری تہذیب گزشتہ کے آئینہ دار ہیں۔  
 وجہ نے انکو بیا بیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس طرح مسدس  
 کے غارم یہاں کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر کوئی فنکار نے کسی  
 شاہکار کو ایسے فن میں اس طرح پیش کرے کہ اس شاہکار کی ہو جو

تصویر معلوم ہوتے ہوئے بھی دوسرے شائبہ کاروں کی نمائندگی کرے تو یہ فنکار کی فنی چابکدستی کی دلیل ہے اور زبان و بیان پر اسکی فتح !

وجہ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، اور جن جن مضامین کو اپنے اشعار میں سمویا ہے موضوع و مضامین کے لحاظ سے اکثر ان کے ہم عصر شعراء کے یہاں کبھی ملتے ہیں۔ لیکن وجہ نے ان کے ساتھ جو انصاف کیلئے وہ شاید ہی کہیں کسی دوسری جگہ ملتا ہو۔ تلج محل پر ساحر لدھیالوی اور وجہ دونوں نے قلم اٹھایا اور دیگر شعراء نے بھی تلج محل پر لکھا ہے، لیکن دونوں کی طرز ادا اور افکار میں فرق پایا جاتا ہے۔ ساحر کے ہاں ایک تیزی، تندہی و سرچرٹھنے والا جنوں اور تھن بھلاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ وجہ کے پاس نغمگی شیرینی و سرشاری کے عناصر ملتے ہیں اس کے علاوہ وجہ کی غزل کے اشعار مخدوم، شاد و صدف لہتی اور عبد القیوم خاں باقی کے اشعار سے موضوع و مفہوم میں ملتے جلتے ہیں۔ لیکن وجہ نے جس طرح داری سے کام لیا ہے اسکی وجہ سے ان کے اشعار میں معنویت کی ایک نئی سطح ابھرتی اور قاری پر

ایک اور ہی تاثر مرتب ہوتا ہے ۔ ۵

مخدوم کا ایک شعر ۔ آج تو تلخی دوراں بھی بہت ہلکی ہے

گگھوں دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

اب وحید کا شعر ملاحظہ ہو ۔

ہاں اسی دور میں پینے کا منرا ہے یارو

بڑھ گئی تلخی مٹے تلخی ایام کے ساتھ

نبد القیوم خاں باقی کا شعر ہے ۔ مجھے اب کیا ڈرا پیگے اندھیرے

چراغ دل سے اچھے حبار ہا ہوں

وحید نے اسی مفہوم کو ذرا اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے ۵

ڈرا سکتے نہیں خونی اندھیرے

نگاہ بے دلاں ظلمت شکن ہے

شاہر صدیقی نے غزل میں مسائل حیات کو پیش کیا ان کا ایک

شعر جس کی اسکا حقیقت پڑے

عروج ماہ کو انساں سمجھ گیا لیکن

ہنوز عظمت انساں سے آگہی کم ہے

اور اب وحید کا شعر ملاحظہ ہو ۵

عالم نے یوں تو بہت عقدہ مشکل کھولے

راز غنیہ فطرت کے نہاں اور بھی ہیں



وحید کے ہاں غالب، جگر، سودا کے رنگ ورس سے بھری  
غزلیں بھی ملتی ہیں۔ جگر کا شعر ہجر سے شاد وصل سے ناشاد

کیا طبیعت جگر نے پائی ہے  
اب وحید کا شعر ہے  
کبھی آرام سے ناخوش کبھی تکلیف میں خوش  
اس شعر میں لفظ 'کبھی' سے واقعہ کو حقیقت آمیز بنا دیا ہے۔  
دل سے ہجومِ غم افسردہ سے پھرتا ہوں

غالب کا شعر ہے  
ہے فضا میں شراب کا تاثیر

بادہ نوشی ہے بادیہیاں !!

اور وحید کا شعر ہے  
ہوا میں کیف صہبائے کہن ہے

فضا آئینہ دار فکرو فن ہے

جیسا کہ وحید نے اپنے مضمون "میں اور میرا فن" میں لکھا  
ہے کہ وہ ترمیم و تنسیخ کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے  
اپنے فن کو دشمن کی نظر سے دیکھا ہے اور بڑی فرخندہ و خندہ

پیشانی سے اپنے اشعار میں رد و بدل کیا ہے۔ وہ اپنے کہے پر  
اڑنے والے شعراء میں نہیں، مستند ہے میرا فرمایا ہوا کی تعالیٰ ان کے پاس  
تھیں۔ ایک ہیرے کی خوبصورتی اور چمک میں تراش خراش کے بعد  
ہی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح فن پارے بھی کاٹ چھانٹ سکے

مارن سے ہو کر ہی مقام معراج تک جا پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بموجب :

”وہ کلام میں ترمیم تنسیخ اور تصحیح کے بھی قائل ہیں۔ بیاضِ مریم اور انتخاب میں ابتدائی دور کے کہے ہوئے بہت سے شعر اصلاح اور نئی آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وجہ اس تصور کے حامل ہیں کہ خیال، ذہن و احساس کی خلوتوں میں شعلہ ریز ہو جائے اور شخصیت کی کھٹی میں تپ کر کس دن بن جائے تو دلنوازی

اور سحرِ فریبی کے محاسن سے آشنا ہو سکتا ہے۔“ لہٰذا رونقِ گلشن، ہستی کسی عنوان ہونا۔ کے مصداق و حید کی بعض منظومات ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں مختلف عنوانات کے تحت آئی ہیں۔ جیسے ”آفتاب تازہ“ میں ان کی ”صبح تو“ نظم ”اوراقِ مصور“ میں ”آثارِ سحر“ کے زیر عنوان ’چلا گیا‘ کل صبح کے عنوان کے تحت اور نقوشِ ساحل، نقش و نگار عنوان کے تحت لاجپور سیدہ جعفر ”دھیرک نظم نگاری“ جیشن و حید اورنگ آباد ۱۹۸۲ء

لکھی گئی ہیں۔ عنوان کی تبدیلی سے کوئی خاص تاثر تو پیدا ہوتا ہے۔  
 البتہ شاعر کی تبدیلی طبیعت سے ہم بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔  
 اس طرح "اوراق مصور" کی بعض منظومات، بیاض مریم، اور انتخابات  
 میں بدلے ہوئے عنوانات کے تحت نظر آتی ہیں۔ حسین کا آریٹا  
 حسین کی تصویریں میں بدل جاتا ہے۔ اور گلشنشاں "باتیں" میں  
 کھیل، شاعر کے کھیل، اور کامیابی، عظیم کامیابی میں تبدیل  
 ہو جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اشعار میں حذف و اضافہ کا  
 تعلق ہے اس سے واقعی ان کا حسن نکھر آتا ہے۔ نظم "رقاصہ"  
 کا ایک شعر آفتاب تازہ میں یوں ہے۔

اٹھی موج مٹے کی طرح انجن میں  
 بدلنے لگی کمر وٹیں جان و تن میں

اب اسی شعر کو اوراق مصور میں اور انتخابات میں پڑھئے۔

اٹھی موج مٹے کی طرح انجن میں  
 تر پنے لگی بجلیاں جان و تن میں

نظم "رقاصہ" ہی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ آفتاب تازہ میں  
 یوں ملے گا۔

خم و پیح و پیکر کے نازک اشارے  
 نئی زندگی کے مظاہر ہیں سارے  
 اس کو ذرا سا بدل کر اوراق مصور اور انتخاب ہیں اس طرح  
 پیش کیا گیا ہے۔۔۔

خم و پیح و پیکر کے نازک اشارے  
 ہواں زندگی کے کرشمے ہیں سارے  
 اس طرح و جدتے خفیف سی تبدیلی کر کے اپنی منظومات  
 کی صورتی حیثیت کو نقصان نہ پہنچاتے ہوئے بھی اس کے معنوی  
 حسن کو نکھرا رہے۔ اس طرح کے حذف و اضافے ان کی اکثر  
 منظومات میں پائی جاتی ہیں۔ جیسے "نیلی ناگن" عالم آشوب،  
 اے دوست آنکھ چیں، نقوش ساحل، نظیر اکبر آبادی، جگنو  
 اجنٹا، کھلواڑی، پیام اقبال، بشارت، کما ہیم وغیرہ۔

نظم تحسین ناشناس، آفتاب تازہ سے اوراق مصور میں  
 شامل ہوتے ہوئے تین اشعار سے محروم ہو جاتی ہے۔ جو بعد میں  
 نئی آفتاب اور کچھ نئے اشعار کے اضافے کے ساتھ بعنوان  
 "ایک تبصرہ نگار کے نام" شائع ہوئی، حسین کا آٹا (اوراق مصور)

سے بیاض سریم ہیں حسین کی تصویریں میں بد لسنے تک کمی  
اشعار کے اضافے اور کئی مصرعوں میں رد و بدل سے دو چار ہوتی  
ہے۔ اس سے وحدہ کی سیما ب صفت اے قرار طبیعت اور خوب  
سے خوب تر کی تلاش کا رجحان بھی مترشح ہوتا ہے۔

رنگ کا یہ ہنگامہ خواب ہے کہ بیداری  
پرفشاں لگتا ہوں میں سا دگی و پکاری (حیدر علی)

اب دیکھئے حسین کی تصویریں۔

آرزو کا ہنگامہ، میکروں کی بیداری

پرفشاں اداؤں میں سا دگی و پکاری

متذکرہ بالا پہلے شعر میں رنگ، ہنگامہ، لگا ہوں اور دگیا میں گنا  
مٹھنے کی بے جا تکرار سے پس آگیا کہ کیا پنا پیدا ہوتا ہے۔ اور

اب حسین کی تصویریں ہیں۔ آرزو کا ہنگامہ، پرفشاں اداؤں

اس ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہی اس کی شعریت میں

تبدیل رونق افزا ہوتا ہے۔ وحدہ کا مخصوص طریقہ انداز شعریت سے

بھرپور وسیلے اشعار ہر محل و موقع پر یاد کیے جا سکیں گے جگہ

مراد آبادی نے کہا ہے۔

اچکے شعر غیر فانی ہیں

حضرت وحید واہ کیا کہتا!

ان کے اشعار کے جمال و جلال کو دیکھتے ہوئے ان کے  
زیر طبع دیوان کے لئے "جمال اجنتا جلال ہمالہ" نام نہایت  
موزوں بیسپہرہ و سجد کی شاعری بھی جمال اجنتا اور جلال ہمالہ  
کی تفسیر ہے۔ جو ان کے نقش کی طرح دیرپا و ہمالہ کی بلندی  
کی طرح ارفع رہے گی۔

کمند گردش ایام کے اسیر نہیں!

نقوش دست عقیدت قنایں نہیں

وحید کے اشعار عقیدت کے پھول سے کم نہیں۔ برصغیر کی  
اس تہذیب و تمدن کی طرح جو ہمارے پیش روؤں کی پونجی ہے  
ہمارے بزرگوں کا ورثہ ہے۔ اس طرح یہ اشعار بھی ہمارے بزرگ  
شاعر کا عطیہ و ورثہ ہیں ہمارے نام، اور ہماری بعد کی نسل  
کے نام۔ جب تک جامعہ عثمانیہ کی عظیم الشان عمارت قائم رہے۔  
جب تک اجنتا ایلورا کے نقش اور تاج محل باقی رہیں، اور  
جب تک کاروان زندگی رواں دواں رہے اور جب تک ملکیت

جہوریت کا بول بانا رہے، اور جب تک عظمت انسان  
 باقی رہے و جد کے اشعار پڑھے جاتے رہیں گے۔ پھر  
 جاتے رہیں گے۔ ان کے کلیات شائع ہوتے رہیں گے اور  
 قائم ہوتے رہیں گے۔ نمبر نکلتے رہیں گے۔ اسی طرح و جد کی  
 شاعری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی اور بہا رہے دل میں گھر  
 کرتا رہے گی۔ و جد کا ارتحال شخص کا ارتحال رہا شاعر تو ہمیشہ  
 ہم سب کے ساتھ رہیں گے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ و جد کو ان کے  
 عہد میں وہ مشہرت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔  
 اپنی مثال میں شبِ غم لبس نہ ہوئی!  
 پیوند فرسش خاک ہوئے تیرے سحر ہوئی

# کتابیات

- شمار نمبر نام یا مرتب مصنف تیب نام تصنیف ناشر سن اشاعت طبع نمبر
- ۱ آزاد ابوالکلام مرتضی بہاری آزادی اور نیٹ لوگیس پہلی اشاعت
- ۲ ارباب سلیمان حیدر آباد شاعر محمد مجیب بھٹی آندھرا پدیش سٹیہ
- ۳ باقی عبد القیوم خاں اور شعراء عثمانیہ ادارہ ادبیات اردو اکادمی حیدر آباد ۱۹۶۲ء
- ۴ قریشی حمید معین الدین مرقع سخن حیدر آباد ۱۹۳۹ء
- ۵ بان ڈاکٹر گستاوی جتہ سنگھ سنگھ کتب خانہ نذیر حسین مسلم منزل کھاری باؤنی دہلی
- ۶ ثانی زرینہ اردو شاعری کی نسیم بکچر پولوٹوش
- ۷ ہندوستان روح لکھنؤ ۱۹۶۷ء
- ۸ جاوید پیر فنیئر لیان طہر اسلوب اور انتقاد نیشنل بک ڈپو ممبئی کمان حیدر آباد ۱۹۶۹ء



۱۹۷۱ پہلی بار

یورپی اثرات دہلی۔ ۱۹۶۸ء ۱۱

۱۔ خال محمد ساقی مستعد      ماسٹر عالمگیری      نفیس الہیدی کراچی

رضی الدینی صدیقی اضافیت انجمن ترقی اردو سندھ ۱۹۵۰ء

رقعت مبارک الدین "پن چکی" اور اُردو ادبیات اردو ۱۹۵۶ء ۱۱

اربعہ سلطانیہ      فن اور فنکار      مجلس تحقیقات اردو

حیدرآباد - ۱۹۴۱ء

روزنامہ البرید شمس الدین اردو شاعری سائیتھ اکیڈمی ۱۹۶۰ء ۱۱

قاری انتخاب نئی دہلی۔

راستگاران ادیب      اداره ادبیات اردو      ۱۱

شمار نمبر نام مصنف یا مترجم نام تصنیف نام نشر سن اشاعت طبع نمبر

۱۶ زینت ساجدہ آندھرا پیدیش سابتہ ۱۹۶۲ء

پرو قیصر حیدر آباد کے ادیب اکید کی حیدر آباد۔

۱۷ سرور آل احمد اردو شاعری کا انتخابی انجمن ترقی اردو ۱۹۶۷ء چوتھا ایڈیشن

۱۸ سروری پرو فیض محمد القادر اردو کی ادبی تاریخ مسٹر شیخ محمد عثمان سنہ ۱۹۷۵ء پہلی بار

۱۹ حیدر آباد کن کی تعلیمی ترقی مکتبہ ابراہیم علی محمد الدین حیدر آباد

۲۰ شارب رود ولوی گل صد برگ حمید قیصر آبادی ۱۹۶۰ء

۲۱ شاہزادہ حمید الدین "حیدر آباد کے شاعر" آندھرا پیدیش سابتہ ۱۹۵۸ء

اکید کی حیدر آباد۔

۲۲ شمس الرحمن فاروقی فاروقی کے تبصرے شب کتاب گھر آباد ۱۹۶۸ء

۲۳ ظا انصاری کتاب شناسی مکتبہ جامعہ لکھنؤ ۱۹۸۱ء

۲۴ ظفر الحسن مرزا ذکر یار چلے حسامی بیکہ لکھنؤ چھاپی

۱۹۷۹ء حیدر آباد۔

۲۵ عمر گزشتہ کتاب " ۱۹۷۸ء

۲۶ عبد الوہید جدید شعرائے اردو فیروز پبلشرز پشاور ۱۹۷۹ء

- ۲۷ عنوان چشتی پروفیسر تنقید سے تحقیق تک عنوان چشتی دہلی ۱۹۷۷
- ۲۸ کمیل جانس مترجمہ عہد لارڈ مونٹ نفیس اکیڈمی بلاس اسٹریٹ
- یونس احمد بیٹن۔ کراچی۔ ۱۹۶۲ء
- ۲۹ محمد حسن پروفیسر شعر تو ادارہ فروغ اردو ۱۹۶۱ء
- المن آباد پارک لکھنؤ
- ۳۰ نظر حیدر آباد اقبال اور حیدر آباد اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی ۱۹۶۱ء
- ۳۱ معنی تبسم ہانی حیات شخصیت اور شاعری۔
- ۳۲ وحید سکتہ زلی آفتاب تازہ جیتنا پیر کاٹن لکھنؤ حیدر آباد ۱۹۵۲ء
- ۳۳ انتخاب انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۷۷ء
- ۳۴ اوراق مصور حکیمہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۶۳ء
- ۳۵ بیاض مریم " ۱۹۷۴ء
- ۳۶ اہو ترنگ عبدالحق اکیڈمی حیدر آباد ۱۹۷۷ء
- ۳۷ یوسف ناظم سائے اور ہم سائے زندہ دلاں حیدر آباد ۱۹۷۵ء
- ۳۸ وحید شاعر و شخص سکتہ جامعہ لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۸۷ء

# رسائل و حرائد

- ۱۔ آج کل ماہنامہ نئی دہلی اگست ۱۹۸۲ء جون و نومبر ۱۹۸۲ء ستمبر ۱۹۸۲ء
- ۲۔ اردو ادب سہ ماہی دہلی دسمبر ۱۹۸۲ء شماره ۲ ۱۹۸۲ء
- ۳۔ ارمغان حش الماس سالنامہ، حیدرآباد ۱۹۸۲ء
- ۴۔ امکان سہ ماہی بمبئی شماره ۱ ۱۹۸۲ء
- ۵۔ بلنر سفته روزه بمبئی ۱۵ جولائی اور ۲۴ ستمبر ۱۹۸۲ء
- ۶۔ سب رس ماہنامہ، حیدرآباد اگست ۱۹۸۲ء جون ۱۹۸۲ء جنوری فوری ۱۹۸۲ء، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء اپریل جون ۱۹۸۲ء
- ۷۔ سوسیر حشن وجد امرتنگ آباد ۱۹۸۲ء
- ۸۔ سیاست روزنامہ ۲۱ مئی ۱۹۸۲ء ۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء
- ۲۸ دسمبر ۱۹۸۲ء، ۱۹ مئی ۱۹۸۲ء مئی ۱۹۸۲ء
- ۹۔ "صبا" ماہنامہ حیدرآباد دسمبر ۱۹۸۲ء

۱. منی اور شخصیت غزل نمبر یکمی مارچ ۱۹۷۸ء
۱۱. کتاب نما ماہنامہ یکمی مارچ ۱۹۸۱ء
۱۲. مبصر ماہنامہ حیدرآباد مارچ ۱۹۷۷ء
۱۳. مجلہ عثمانیہ سہ ماہی حیدرآباد ۱۹۳۴ء شمارہ ۷۳
۱۴. منصف روزنامہ حیدرآباد بہار دسمبر ۱۹۸۲ء ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱ جولائی

۱۵. نقوش شخصیت نمبر ماہنامہ لاہور ۱۹۵۵ء
۱۶. ہماری زبان سہ ماہی روزہ انجمن ترقی اردو ہند یکم نومبر ۱۹۷۵ء
- مکاتیب وحید بنام سریم بیکراشی
- عابد علی خاں " "
- ڈاکٹر ذاکر حسین بنام وحید